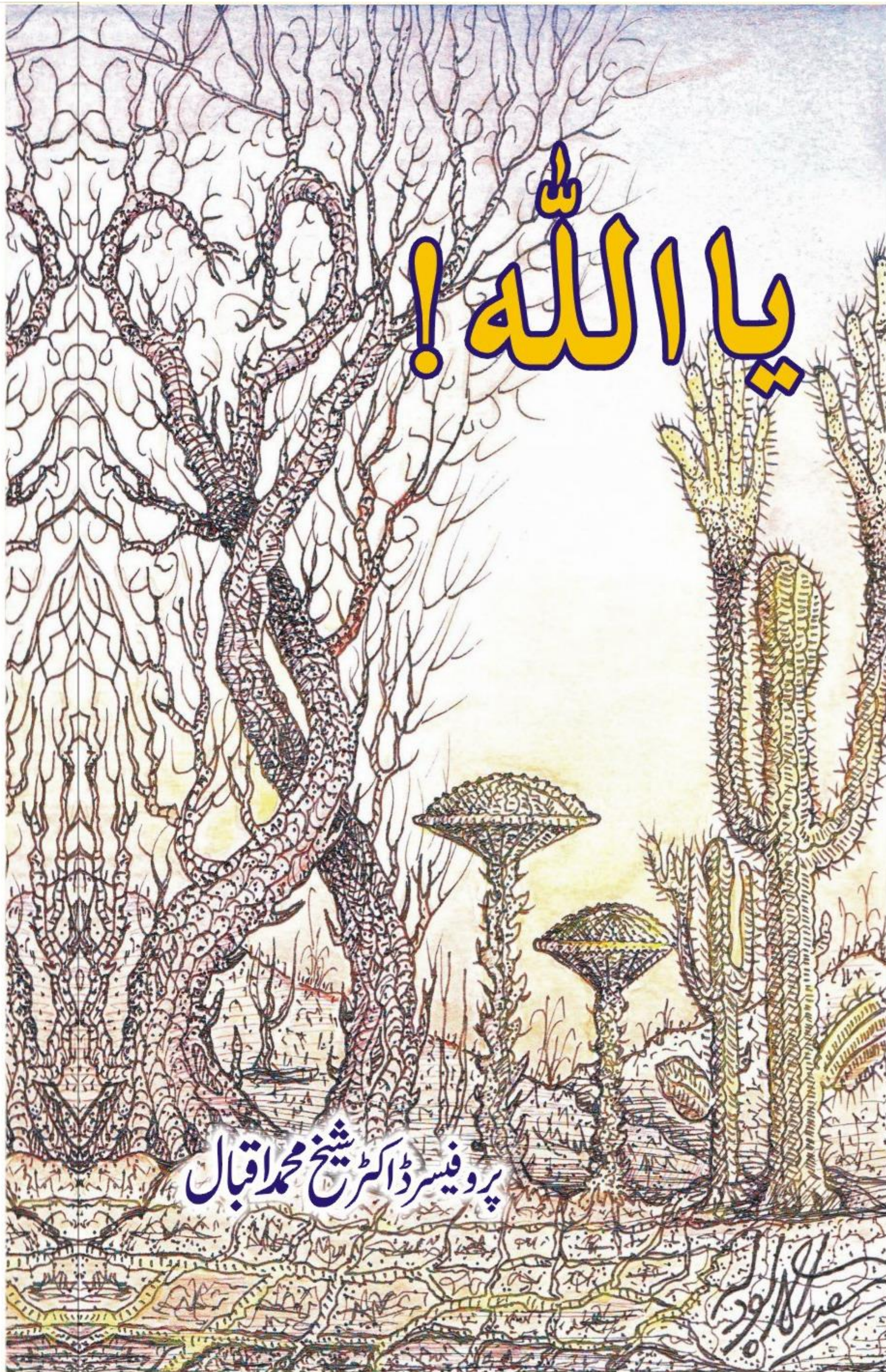


یا اللہ!
پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

یااللہ!

(مجموعۂ مضامین)

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

ایم اے انگلش، ایم اے اُردو

ایم فل (گولڈ میڈلسٹ)، پی ایچ ڈی

یااللہ!

کتاب کا نام:	یااللہ!
مصنف:	پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال
تعداد:	300
کمپوزنگ:	تنویر احمد
سرورق:	سعید احمد بوطہ
طابع:	طلوعِ اشک پبلیکیشنز لاہور
ناشر:	پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال
اشاعت:	2018ء
قیمت:	300/- روپے

ملنے کا پتہ:

131۔رحمت پارک یونیورسٹی روڈ سرگودہا

فون: 03004489399, 048-3226686

email. iqbalsheikh68@yahoo.com

شاہد بخاری

651-D فیصل ٹاؤن لاہور

042-5161149, 03004855148

انتساب

آئندہ آنے والی نسلوں کے نام
جن کے حوالے سے
ہم نے مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا ہے

فہرست

نمبر شمار	عنوانات		صفحہ نمبر
1۔	عرضِ مصنف		6
2۔	سخن ہائے گفتنی	شاہد بخاری ایڈووکیٹ	8
1۔	میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی		11
2۔	ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے		14
3۔	تم وہ کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے		17
4۔	ہرگز نہ میرد آنکہ دِلش زندہ شد با عشق		20
5۔	قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن		24
6۔	سفر، سفر ہے یہاں گھر کی راحتیں مت ڈھونڈ		27
7۔	عقل کی منطق جدا ہے دل کی منطق اور ہے		30
8۔	ہر گھڑی خونِ تمنا نہیں دیکھا جاتا		33
9۔	دل کی لگی، لگی رہی ختم فسانہ ہو گیا		36
10۔	پاک سرزمین شاد باد		39
11۔	شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا		42
12۔	تبلیغِ حق		47
13۔	کھیلیں اور حبِ وطن		50
14۔	بے چارے شوہر		53
15۔	خودی کا سرِ نہاں ۔۔لا الٰہ الا اللہ		56

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
16۔	خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے	59
17۔	رات گئی بات گئی	63
18۔	جو بڑھ کر تھام لے خود ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے	67
19۔	غزل اس نے چھیڑی	71
20۔	اُف یہ صبحیں اُف یہ شامیں	74
21۔	پڑھا لکھا پاکستان	78
22۔	نصابی مسائل	82
23۔	زبان کا مسئلہ	87
24۔	اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے	92
25۔	صید بھی ہم صیاد بھی ہم	95
26۔	قیامتِ صغریٰ	100
27۔	حصولِ تعلیم ایک چیلنج	103
28۔	ہم ہنوز پتھر کے دور میں سانس لے رہے ہیں	106
29۔	ماہنامہ سفید چھڑی کے پچیس سال	109
30۔	تاریخ ایک حقیقت یا افسانہ	113
31۔	جنونِ تحریر	116
32۔	خواب اور تعبیرِ خواب	119
33۔	ہمتِ عالی کو میں بے بال و پر اچھالوں گا	122
34۔	قرض کا آسیب	125

عرضِ مصنف

گزشتہ چھ برس کی ماہنامہ سفید چھڑی میں شائع ہونے والی تحریریں نذرِ قارئین ہیں پہلے بھی سفید چھڑی کے قارئین کی نظر سے یہ تحریریں ضرور گزری ہوں گی بہت سے احباب نے میری ان قلمی کاوشوں کے حوالے سے بہت حوصلہ افزائی کی ہے میں سمجھتا ہوں کہ جس دل سوزی اور خلوصِ نیت سے یہ حروف میں نے سپردِ قرطاس کئے ہیں وہ میرے لئے اطمینان کا باعث ہیں لیکن جانے دل میں اور کیا کیا خیالات جنم لیتے ہیں، بہت سے ایسے ہیں جو مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں میں معاشرتی اور معاشی صورتحال پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو یقین مانیئے دل خون کے آنسو روتا ہے، میرے لفظوں میں اتنی توانائی نہیں کہ اس دکھ کا اظہار کر سکیں جو میرے دل میں اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کو دیکھ کر جنم لیتا ہے، الفاظ بے جان ہیں اور درد شدید۔

میں اپنی کوشش جاری رکھوں گا کہ جو کچھ ہمارے وطن عزیز میں ہو رہا ہے اور جو کچھ عالمِ انسانیت پر بیت رہا ہے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہوں۔ یہ جو کچھ بیت رہا ہے بڑی حد تک ہم خود بھی اس کے ذمہ دار ہیں ہمیں انفرادی طور بھی غور کرنا چاہیے کہ ہم اس صورتحال سے نجات پانے کے لئے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اصلاح کا آغاز اپنی ذات سے ہونا چاہیے اور ہمیں اپنا کڑا احتساب کرتے رہنا چاہیے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم محض تنقید برائے تنقید کا شکار ہو رہے ہوں اور ہمیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہ آ رہا ہو۔

بہر کیف ملی اور ملکی صورتحال انتہائی مخدوش ہے جس کے ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر خود ذمہ دار ہیں۔ ان تحریروں میں میں نے اپنے انہی خیالات کا اظہار کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے اور ماہنامہ سفید چھڑی کے ذریعے تا دمِ آخر یہ کاوش جاری رہے گی۔

"یااللہ" کی ترتیب اور طباعت کے حوالے سے میں اپنے تمام احباب کا شکر گزار ہوں جو قدم قدم پر میرا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ جن میں برادرم شاہد بخاری، سعید احمد بوٹا، عبدالباسط سہیل، پروفیسر شاہد اسلام دانش، سید نسیم الغنی، نسیم اقبال بھٹی، ڈاکٹر شفیق آصف، شاکر کنڈان اور تنویر احمد شامل ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال

یکم جولائی 2018ء

سخن ہائے گفتنی

ماہنامہ سفید چھڑی کی مجلس ادارت کا شکر گزار ہوں جس نے پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال کے تحریر کئے گئے اداریوں کا انتخاب کر کے مجھے اپنی رائے پیش کرنے کے لئے ارسال کیا۔ یہ اداریے انتہائی فکر انگیز اور قابلِ مطالعہ ہیں کیونکہ یہ اہم موضوعات پر سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر شیخ اقبال کا مطالعہ وسیع اور زندگی کا شعور نہایت عمیق ہے۔ ان کا نمایاں وصف ان کا مشاہدہ ہے جو ان اداریوں میں دکھائی دیتا ہے جو موقع کی مناسبت سے سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ تاریخ و ادب پر ڈاکٹر صاحب کی گہری نظر ہے۔ اپنی ذہنی اپج اور محبتِ انسانی کی وجہ سے وہ بہت سے اہم اور فکر انگیز موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ مجھے ان کی تحریروں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے، جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان میں حق گوئی اور بے باکی کا مظاہرہ بھی ہے اور خلوص و جذبے کی صداقت کا بھرپور اظہار بھی۔ یہ مضامین قارئین کو دعوتِ مطالعہ بھی دیتے ہیں اور دعوتِ فکر و عمل بھی۔ آپ چند جملوں میں وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جنھیں بیان کرنے کے لئے دوسروں کو کئی صفحے درکار ہوں۔ مندرجہ ذیل جملے مثال کے طور پر درج ہیں۔

'وقت گرفت میں لینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم لمحوں میں جینا سیکھیں اور دوسروں کو جینے دیں' (مارچ ۲۰۱۷)

"روحانیت اور اصلاحی کتب کے اگر اثرات ہوتے تو کچھ تو ظلم کم ہوتا، کچھ تو بے انصافی کا قلع قمع ہوتا، بدیانتی کچھ تو کم ہوتی، انسان میں درندگی کا کچھ تو خاتمہ ہوتا" (جنوری 2017)

"ماہنامہ سفید چھڑی، جاری کرنے کا مقصد کچھ غلط فہمیوں کو دور کرنا اور نابیناؤں کے بارے میں لوگوں کے تصورات میں مثبت تبدیلیاں لانا تھا۔" (اگست 2016)

”یہ وہ پتھر کا دور ہے جہاں پتھر بے حرکت نہیں ہوتے۔۔۔۔ایک پتھر علم کا پتھر ہے جس نے دوسروں پر برسنا سیکھا ہے،ایک جہالت کا پتھر ہے جسے کچھ سمجھ ہی نہیں کہ اپنے آپ کو ریزہ ریزہ کرنا ہے یا کسی اور کو“(اپریل 2016)

”جب ہم معاشی عدل وانصاف کی بات کرتے ہیں تو یار لوگ اسے اشتراکیت سے منسوب کر دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟(ستمبر 2015)“

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

تمہارے مصارف سے جو بچ رہے
کرو خرچ راہِ خدا میں اسے

ڈاکٹر اقبال نکتہ شناس، پختہ شعور کہنہ مشق شاعر وادیب، مستند محقق اور بالغ نظر دانشور ہیں جن کے علم ودانش کی جھلکیاں جابجا ان کی تحریروں میں جھلکتی ہیں۔ثبوت کے طور پر اس کتاب ہی کو پڑھ کر دیکھ لیجئے۔

شاہد بخاری(ایڈووکیٹ)
651/D فیصل ٹاؤن۔لاہور

ترے ہر کام میں ہے مصلحت پر تیری دنیا میں
کوئی بھوکا، کوئی بے گھر، ذرا اچھا نہیں لگتا

میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

میرا دُکھ ذاتی بھی ہے اور آفاقی بھی کیونکہ جو مجھے لاحق ہے وہ میری ذات ہی سے جڑا ہوا ہے لیکن چونکہ میں ایک انسان ہوں اس لئے جس طرح کا دُکھ مجھے لاحق ہے وہ میرے پڑوسی، میرے شہر میں رہنے والے اور میرے ملک میں آباد بلکہ پوری دنیا کے باسیوں کو لاحق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ میرے پڑوس میں رہنے والا، میرے شہر میں آباد اور میرا ہم وطن اور دنیا کے کسی حصے میں جاگزیں فرد بالآخر انسان ہے، لیکن اکثر و بیشتر ہم اپنے ہی دکھ کو سب سے بڑا دکھ تصور کرنے لگتے ہیں اور ہم ہی کیا ہمارے اہلِ محلہ، اہلِ شہر، اہلِ وطن اور دنیا کے باسی ہمارے دُکھ کو صرف ہمارا دکھ تصور کر کے نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ اتنی چھوٹی سی بات ہمیں سمجھ میں نہیں آتی۔ جب میں گرتا ہوں تو مجھے اتنی ہی چوٹ آتی ہے جتنی کہ کسی اور کو، جب کوئی تیر سینے میں پیوست ہوتا ہے تو اس کا زخم اتنا ہی گہرا ہوتا ہے جتنا کسی اور سینے میں پیوست ہونے والے تیر کا۔ یہ الگ بات کہ کسی میں قوتِ برداشت کم ہوتی ہے اور کسی میں زیادہ، لیکن اس سے تیر کے زخم کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے جسے سمجھنا بہت ہی آسان ہے لیکن بہت ہی مشکل بن گیا ہے۔ اگر کوئی افریقہ میں بھوکا مر رہا ہو، اگر ایشیا میں کسی کے تن پر کپڑا نہ ہو اور اگر لاطینی امریکہ میں کسی کے سر پر چھت نہ ہو تو متمول ممالک کو فرق ہی نہیں پڑتا، وہ خوش ہیں تو سبھی خوش ہوں گے، کوئی تیس چالیس سال پہلے اقوامِ متحدہ کے ایک ادارے نے فیصلہ کیا تھا کہ متمول اقوام اپنی دولت کا دو فیصد غریب اقوام پر خرچ کرنے کے پابند ہوں گے۔ یہ اصول جن اقوام نے مرتب کیا تھا ان ہی نے توڑ دیا۔ World Bank یا IMF اور دیگر Agencies کے ذریعے ضرورت مند ممالک کو جو مدد فراہم کی جاتی ہے وہ مدد کم اور سیاسی مصلحت زیادہ ہوتی ہے، کسی بھوکے کے منہ میں نوالہ ڈال دیجئے اور پھر جب چاہے ایک ایک

اشارے پر رقص کروایئے، اس سے جو چاہے منوایئے اور وہ بھی مجبور، بے دست و پا اور بے بس ہے اسے یار کو منانے کے لئے ناچنا ہی پڑے گا، زنجیر پہن کر رقص کرنا ہی ہوگا اور اس کے لب پر کوئی حرفِ شکایت نہ ہوگا۔ یہ کتنی بڑی سماجی ناانصافی ہے، کتنا بڑا انسانی جرم۔ ذرا تصور تو کیجئے کہ انسان، انسان کو غلام بنا لے اس لئے کہ اس کے تن پر کپڑا نہیں اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا نہیں۔ تو پھر سوچیئے ایسے افراد اور اقوام پر کوئی اخلاقیات کارفرما ہو سکتی ہے! کون سا مسیحی قانون نافذ العمل ہو سکتا ہے، کون سی اسلامی تعلیم کارگر ہو سکتی ہے! انسان کی سب سے پہلی ضرورت اس کی زندگی ہے اور اگر اسے زندگی ہی میسر نہ آئے تو اخلاقیات، عمرانیات اور دینیات کیا کردار ادا کر سکتی ہیں؟

ہر فرد کو اپنے ہی دکھ سے سروکار یقیناً ہوتا ہے جب اس کا دکھ اپنی جگہ قائم ہے تو اس کو کسی کے سکھ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ ذمہ داری انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ اگر کوئی فرد خوشحال ہے تو اسے دیکھنا ہوگا کہ معاشرے کا کیا حال ہے اور اگر کوئی معاشرہ متمول ہے تو اسے ہر فرد کی کفالت کرنا ہوگی دراصل فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے الگ نہیں، افراد کے اجتماع کو ہی معاشرہ کہا جاتا ہے، معاشرہ کوئی الگ تھلگ چیز نہیں۔ جب معاشرے میں کوئی چیخ اٹھے گی تو جلد نہ سہی کچھ دیر سے ہی سہی اس کی نیندوں کو حرام کر دے گی، تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جب فرانس میں ظلم اپنی آخری حد کو پہنچ گیا تو انقلابِ فرانس برپا ہوا، اسی طرح کا انقلاب روس میں آیا، اسی طرح کی فکر چین میں بیدار ہوئی، یہی کچھ افریقی ممالک کی جنگِ آزادی میں چشمِ فلک نے دیکھا اور یہی انسان کی کہانی ہے جو کبھی تاریخ بیان کرتی ہے تو کبھی عمرانیات، کبھی ماہرینِ نفسیات اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو کبھی اخلاقیات کے علم بردار۔ کون نہیں جانتا کہ امیر المومنین سیدنا حضرت عمرؓ کے سامنے جب ایک چور کو پیش کیا گیا تو ان کی رائے کیا تھی انہوں نے کہا تھا کہ یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ چور چوری پر مجبور کیوں ہوا ہے اور یہی بات بائبل کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے کہی تھی کہ گناہ گار کو سنگسار وہ کرے جس سے ایسا گناہ سرزد نہ ہوا ہو۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی

بڑی حقیقت سے ہم صرفِ نظر کیسے کر لیتے ہیں؟ آسمانی کتابوں کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے کہ سب لوگ اللہ کی مخلوق ہیں اور سب کی بنیادی کم وبیش ضرورتیں ایک جیسی ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ بعض مذہبی رسوم کو تو وظیفہ حیات بنا لیا جاتا ہے لیکن مذاہب کی اصل روح کو درخورِ اعتناء ہی نہیں سمجھا جاتا اس حقیقت کا انتہائی خوبصورت اظہار غالبؔ نے خوب کیا تھا۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

لیکن وہ ''کوئی'' کون ہے؟ وہ کوئی کبھی ''میں'' بن جاتا ہوں اور کبھی آپ، کبھی مشرق اور کبھی مغرب، عالمی گاؤں کی بات ان دنوں زبان زدِ عام وخاص ہے، لوگ عالمی گاؤں میں شاید ''عالم'' کی بات کرتے ہیں مگر ''گاؤں'' کی حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ عالمی گاؤں کی اصطلاح بسا اوقات ایک مذاق نظر آتی ہے جو اشخاص گاؤں کی زندگی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہاں اخوت اور برادری کے کیا معیار ہوتے ہیں؟ کس طرح ایک کا دکھ سب کا دکھ بن جاتا ہے اور ایک کی خوشی سب کی خوشی ہوتی ہے، ہاں! وہاں بھی چودھری صاحب پٹواری صاحب اور بابو جی ہوتے ہیں لیکن انکا دل بھی پسیج ہی جاتا ہے، اگر ہمیں دنیا کو ایک کرنا ہے تو ہمیں ایک بات یاد رکھنا ہوگی کہ جب تک ہم ہر شخص کے دُکھ کی دَوا نہیں کرتے تو ساری کوششیں اکارت ہوں گی، سارے نعرے کھوکھلے، سارے دعوے غلط، سارے منشور ڈھونگ اور ساری تحریکیں بے مصرف۔ ہمیں ایک دوسرے کے دُکھ کو سمجھنا ہوگا اور یہ محسوس کرنا ہوگا کہ سب کا درد ہمارا اپنا درد ہے اور یہ توقع کرنی ہوگی کہ ہمارا درد سب لوگ محسوس کرتے ہیں اگر ہمیں دنیا کو سچ مچ اللہ کا کنبہ بنانا ہے تو ہمیں یہی کچھ کرنا ہوگا، بس یہی کچھ۔

☆☆☆

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

شیکسپیئر کے ڈرامے میکبتھ کے ایک کردار ڈنکن جو کہ سکاٹ لینڈ کا بادشاہ ہے، کو جب یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس کا ایک جنرل بغاوت پر اتر آیا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ ایسا کوئی ہنر ایجاد نہیں ہوا جس سے کسی کے ذہن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ چہرے اکثر دھوکہ دے جاتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر کے ناول فردوسِ بریں کے کردار علی وجودی نے پارسائی کا جو جبہ زیب تن کیا ہوا ہے اسے چاک چاک کرنے میں بہت دیر لگتی ہے، یہ تو ہوئی ڈرامے اور ناول کی بات جو کہ زندگی کی نہایت سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ خود ہمیں زندگی میں بھی ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ ہم چیخ اٹھتے ہیں ''تم بھی وہی کچھ نکلے''، ''تم سے تو یہ توقع نہ تھی''، ''تم تو میرے دل و جان کے بالکل قریب تھے''، ''میں نے تم پر اپنی تمام محبتیں نچھاور کر رکھی تھیں'' ایسے میں جو صدمہ دل پر گزرتا ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ہے یہ حادثہ شیکسپیئر کے ایک کردار Timmons of Athens کو بھی پیش آیا تھا اور اسے دنیا سے نفرت ہوگئی تھی۔

کامیاب زندگی کے لئے بہت ضروری ہے کہ ہر ایک سے پیار کیا جائے ہر ایک سے دل داری کی جائے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم ہر وقت ہر شخص کو خوش نہیں رکھ سکتے ماجرتو اللہ سے ملنا ہوتا ہے لیکن اپنے جو دکھ دیتے ہیں کس کرب سے دوچار کرتے ہیں، جس طرح جذبوں کا خون کرتے ہیں، ان سب کا درمان بھی اللہ ہی کے پاس ہے لیکن بالآخر انسان پھر انسان ہے۔ روزانہ اخبارات میں جو کچھ پڑھنے کو ملتا ہے، الیکٹرانک میڈیا جو کچھ پیش کرتا ہے وہ اتنا روح فرسا اور بھیانک ہوتا ہے کہ انسان دہل کر رہ جاتا ہے، ہم اخبار پڑھنا بند کر دیتے ہیں، ٹی وی نہیں دیکھتے لیکن زندگی میں تو یہ ممکن نہیں، جسے ہم اپنا بھائی کہتے ہیں، جو ہماری بہن ہوتی ہے، جو ہمارا باپ اور ہماری اولاد ہے اس سے مفر ممکن نہیں، اگر وہ ستم ڈھانے لگیں تو پھر کہاں اماں ملے

گی،ان کی شکل تو ہمیشہ پردۂ ذہن پر موجود رہے گی،ان سے کہیں نہ کہیں مڈبھیڑ ہو جائے گی،صلۂ رحمی کا اپنا ہی مزہ ہے اور اپنا ہی سواد۔لیکن اگر بھائی برادران یوسف بن جائیں،بجائے محبت اور پیار کی بجائے جنگ وجدل پر اتر آئیں تو پھر دل ودماغ پر کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔یہ درست ہے کہ غیروں سے تو نجات ممکن ہے لیکن اپنے تو جسم کا ناسور بن کر رہ جاتے ہیں۔میں ایک دوست کو جانتا ہوں جس نے اپنے رشتہ داروں سے ہر ممکن اچھا سلوک کیا،ان کی ناز برداری کی،ان کے دکھ سکھ میں کام آیا لیکن وہ ہمیشہ مشکلات کا باعث بنے۔ایک دن وہ حقیقتاً میرے پاس آیا،وہ چیخ اٹھا"ایسے ہوتے ہیں بھائی،ایسی ہوتی ہیں بہنیں"میں نے اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کی اور کہا میرے دوست زندگی میں سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے،زندگی ہے ہی ابتلاء وآزمائش۔وہ جو غالبؔ نے کہا تھا!

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

زندگی اتنی آسان ہوتی تو پھر اتنے الیے اتنے دکھ،اتنے زخم نہ دیکھنے کو ملتے جو روز کا معمول ہے۔لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب کسی پر بیتتی ہے تو اسے درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا جب اپنی ذات پر بیتتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اپنوں کے لگائے ہوئے زخم کتنے کاری،کتنے جاں گسل اور کتنے جان لیوا ہوتے ہیں لیکن اِن سب کو برداشت کرتے رہنا اور ہنستے کھیلتے رہنا ہی زندگی ہے۔مایوسی کفر ہے اور یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہر عمل کا ایک ردِعمل ضرور ہوتا ہے۔

ہم نے مجنو پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

جب آپ کسی پر پتھر پھینکیں گے تو آپ کو بھی پتھروں کے لئے تیار رہنا چاہیے،مکافاتِ عمل اسی کو کہتے ہیں،ضروری نہیں کہ آپ خود انتقام لینے پر اتر آئیں بلکہ ضروری یہ ہے کہ آپ صبر وسکون سے دیکھیں کہ زندگی از خود اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی ہے۔آپ کسی پر ستم کے

پہاڑ توڑتے ہیں تو کوئی پہاڑ آپ پر گر کر آپ کو چُور چُور کر دیتا ہے اور جریدۂ حیات پر آپ کا نام تک باقی نہیں رہتا۔اچھے عمل کی جزا یقیناً اچھائی ہوتی ہے اور بُرا عمل بُرائی پر منتج ہوتا ہے۔تاریخ پڑھ کر دیکھئے،اپنے احباب اور دوستوں سے ان پر بیتے حادثات سن دیکھئے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ زندگی کا انصاف بہت کڑا ہے،خدا کی لاٹھی بے آواز ہے مگر لگتی ضرور ہے۔اچھا معاشرہ قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم معاف کرنا اور درگزر کرنا سیکھ لیں اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں اگر آپ معاف کر دیتے ہیں تو اسے وہ اپنا حق سمجھ بیٹھتے ہیں اور وہ خود ساختہ اندھیری دنیا سے کبھی باہر نکل ہی نہیں پاتے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام معاف کر دینے پر بھی یقین رکھتا ہے اور انتقام پر بھی مگر زندگی انتقام سے مرجھا جاتی ہے اس کا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور زندگی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تاہم یہ تمام عمل زندگی کو خود سرانجام دینا ہوتا ہے اور مظلوم کو اپنا سارا دکھ زندگی کے حوالے کر دینا چاہیے زندگی مہربان بھی ہے اور سفاک بھی،اس لئے کبھی ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ"ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے"

☆☆☆

تم وہ کیوں کہتے ہو، جس پر خود عمل نہیں کرتے

قربان جایئے اس ارشادِ گرامی کے جس میں انسانی نفسیات کا انتہائی بلیغ تجزیہ پیش کیا گیا ہے، بالعموم لوگ وعظ و نصیحت پر کمر بستہ رہتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے احساسِ برتری کی تسکین ہوتی ہے۔ شاید شعوری طور پر وہ یہ سب کچھ محسوس نہ کر رہے ہوں لیکن لاشعوری طور پر وعظ و نصیحت کا ایک محرک احساس برتری کا اثبات بھی ہے۔ نصیحت کرنے والا اپنے آپ کو زیادہ صاحبِ کردار محسوس کرنے لگتا ہے، اس میں کلام نہیں کہ بسا اوقات پند و نصائح میں دردمندی اور دلسوزی کا عنصر بھی بڑی حد تک شامل ہوتا ہے، جیسے ماں باپ اپنے بچوں کو بڑے خلوص کے ساتھ برائیوں سے بچنے اور اچھے عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اپنے تجربات سے انہیں آگاہ کرتے ہیں، کبھی کبھی ایسے عمل میں ان کی آنکھ میں آنسو بھی ہوتے ہیں کیونکہ اس گفتار میں ان کی زندگی کے تلخ تجربے کا اثر موجود ہوتا ہے۔ وہ کسی نے کہا تھا ناں!

مانہ کردیم شماں حذر بہ کنید

اس قول میں ایک نوع کا تاسف اور ملال بھی موجود ہے اور اصلاح کی خواہش بھی۔
غالبؔ نے کس برملا انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا وہ ملاحظہ ہو

یہ کہاں کی دوستی ہے؟ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

شاعر بڑے دکھ سے محسوس کرتا ہے کہ نصیحتیں کرنے والے تو ہزاروں ہیں لیکن دکھ کی دوا کرنے والوں کی کمی ہے بلکہ ایسے احباب تو وقت کے ساتھ ساتھ اور بھی عنقا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ غالب بڑے نبض شناس تھے اور انہیں انسانی نفسیات سے بڑی واقفیت تھی اور ہمیں بھی یہ علم ہے بلکہ تجربات سے اور بزرگوں سے یہ علم حاصل ہوا ہے کہ نصیحت کرنا بڑا آسان ہے اس پر عمل

کرنا مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن، ہاں ایک صورتحال مینارۂ نور ہو سکتی ہے اور تحریک کا باعث بن سکتی ہے وہ یہ کہ کہنے والا اپنے قول کا دھنی ہو اور اپنے قول کو عمل میں ڈھال سکے۔ یعنی کہنے والا یہ کہہ سکے "دیکھو میں نے ایسا کر دکھایا ہے جب میں نے ایسا کر دکھایا ہے تو تم کیوں نہیں کر سکو گے" اور پھر زندہ اور قابلِ تقلید ماڈل کا اثر ہوتا ہی بے پناہ ہے۔ اسلام کی تاریخ تو ایسی شخصیات سے بھری پڑی ہے کہ جنہوں نے نصیحت اپنے عمل سے کی۔ نبی اکرمؐ نے پہلے کر کے دکھایا اور پھر کہا کہ تم بھی ایسا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ ارشاد ہوا کہ نبیؐ سب کے لئے ایک مثالیہ ہیں۔ ان کا اسوۂ حسنہ سب کے لئے روشنی کا منبع ہے۔ حضرت عائشہؓ نے یہی تو فرمایا تھا کہ تم حضورؐ کے اخلاق کے بارے میں کیا پوچھتے ہو وہ تو چلتے پھرتے قرآن ہیں قرآن کی تفسیر ہیں اور اقبال نے اسی حقیقت کو کچھ یوں شعری پیکر عطا کیا تھا۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اور اسی وقت یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں کارکشا کارساز

جب انسان سراپا عمل بنتا ہے، ہدایتِ خداوندی کو اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنا لیتا ہے تو پھر مومن اللہ کا نائب بن جاتا ہے، اللہ کی زبان بن جاتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہے لیکن جب محض وعظ و نصیحت پر اکتفا ہونے لگتا ہے تو پھر نصیحت اثر کھو بیٹھتی ہے، تضیع اوقات بن جاتی ہے اور محض یا وہ گوئی ٹھہرتی ہے یا محض محفل سجانے کا ایک ذریعہ، پیٹ پالنے کا ایک دھندہ۔ دیکھا نہیں آپ نے کہ ہمیں نصیحت کرنے والے ہمارے بعض مذہبی واعظین کس طرح چاندی بناتے ہیں اور کس طرح اپنے حرفوں کو بیچتے ہیں، مقدس ایام میں ان کی دکان خوب چلتی ہے، بڑی گہما گہمی ہوتی ہے، بظاہر جذبۂ خیر سے لبریز یہ لوگ کس طرح دولت سمیٹنے کا ڈھب جانتے ہیں۔ ایک ایک

واعظ کی قیمت لگتی ہے، تقریروں میں خلوص کا اظہار ہوتا ہے لیکن دراصل یہ روٹی کمانے کا ایک خوبصورت ذریعہ ہوتا ہے بلکہ روٹی کیا دنیا کی تمام آسائشیں اکٹھی کرنے کا ایک وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس انداز کو انتہائی تحقیر سے دیکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تم وہ کچھ کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے لیکن افسوس، صد افسوس اس ارشادِ الٰہی کو بھی بالائے طاق رکھا جا رہا ہے اس پر جس قدر غور کیا جائے دکھ ہوتا ہے، کم و بیش ہر شخص نے ناصح مشفق کا چولہ پہن رکھا ہے۔ سکولوں میں وعظ ہے تو کہیں کالجوں میں، اخبارات میں مضامین ہیں تو کہیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خوبصورت تقاریر، خطابات اور مقررانہ اسلوب لیکن عملی زندگی میں اس کا کوئی اظہار ہوتا خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جن کی زبان ان کے دل کی رفیق ہوتی ہے، جن کا قول ان کے عمل کی تصدیق کرتا ہے اور جن کے قول سے عمل کی روشنی پھوٹتی ہے لیکن ایسے اصحابِ قلب و نظر کی تعداد بہت ہی کم ہے انگلیوں پہ گنی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوجوان نسل نصیحتیں سن سن کر تنگ آ جاتی ہے اور کہہ اٹھتی ہے کہ ہمیں کچھ کر کے دکھایا جائے۔ پاکستان کے وجود کے 65 سالوں میں کون سی نصیحت ہے جو نہیں کی گئی، کون سا گر ہے جو نہیں بتایا گیا کون سی پالیسی ہے جو ترتیب نہیں دی گئی، بڑے بڑے منصوبے بنائے گئے، بڑی بڑی تنظیمیں قائم ہوئیں، عالی شان عمارتیں تعمیر کی گئیں جن میں قال اللہ قال الرسول کا اہتمام ہوا لیکن یہ تمام کوششیں بڑی حد تک اکارت ہی گئیں اور سال بہ سال ہمارا اخلاقی گراف گرتا ہی چلا گیا کیونکہ کہا سب نے، اس پر عمل کیا بہت کم نے۔ عمل کا فقدان زندگی کو چاٹ گیا، مکاری کے اندھیرے اجالوں کو نگل گئے، تصنع نے صبحِ امید نمودار ہی نہ ہونے دی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنی غرض کے غلام ہی نہیں اپنے دشمنوں کی اغراض کے غلام بن کر رہ گئے، جنھوں نے ہم سے ہماری عزت بھی چھین لی اور غیرت بھی۔ یہ المناک صورت حال ہمارے قول و فعل کے تضاد کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔

☆☆☆

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد با عشق

حکمِ ربانی ہے کہ ہر چیز کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن شاید عشق اس سے مستثنیٰ ہو اور یقیناً مستثنیٰ ہے کہ عشق کا کوئی ایک جہان نہیں ہوتا، وہ نت نئے جہان آباد کرتا رہتا ہے۔ شاید ازل اور ابد کی حدوں سے کہیں آگے گزر جاتا ہے، عشق دلِ زندہ کا ضامن ہے، جانِ ناتواں کو وہ توانائی اور صلابت عطا کرتا ہے کہ اس میں پہاڑوں کی قوت اور بجلیوں کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے اقبال نے کہا تھا اور کیا خوب کہا تھا۔

عشق کی مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق ہے نورِ حیات، عشق ہے نارِ حیات

عشق دمِ جبرائیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام

اور شاید عشق کے معنی اور اس کی ماہیت جس قدر اقبال کو سمجھ آئی تھی شاید ہی کسی اور کو آئی ہو۔ حافظ شیرازی نے عشق کو کچھ یوں خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

غمے گر لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی باہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

لیکن شاید اب بھی اس کی تفہیم کے بے حساب امکانات موجود ہیں پر بدقسمتی یہ ہے کہ جہاں، جہان والوں نے جہان کی ہر شے کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے وہاں عشق کی بے حرمتی کے مرتکب بھی ہوئے ہیں۔ انگریزی شاعر شیلے کی بات یاد آتی ہے جو اس نے اپنی ایک نظم میں پیش کی تھی۔ اس نے کہا تھا جتنی بے توقیری اور بے حرمتی لفظ عشق کی ہوئی ہے، وہ شاید کسی اور لفظ کی نہیں

ہوئی، انگریزوں کی لغت میں شاید عشق جیسا تو کوئی لفظ نہیں لیکن عشق کی ماہیت گہرائی اور گیرائی سے وہ خوب خوب واقف ہیں کیونکہ ان کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے ان کی آنکھ بھی حسن کے سحر میں کھو کر رہ جاتی ہے اور پھر ہر شے سے اپنی آنکھیں موند لیتی ہے اور صرف عشق ہی کا تماشا ان کی آنکھوں کا مرکز ہوتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ عشق کی گہرائی اور گیرائی کو جس قدر ہمارے صوفی شعراء نے سمجھا ہے اس کی تو کوئی مثال ہی نہیں ملتی۔

چھیتی بوڑیں وے طبیبا! نہیں تاں میں مر گئی آں
تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

عشق جس طرح انسان کو بے خود کر دیتا ہے اور روح میں جو سرور اور کیف بھر دیتا ہے اس کا بیان اردو اور فارسی کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے لیکن کہیں کہیں بلکہ بہت جگہ اردو اور پنجابی شعراء نے عشق سے انصاف نہیں کیا اسے محض گلی کوچوں کی سوغات بنا دیا ہے، چھتوں پر نمائش کے لئے رکھ چھوڑا ہے، بازاروں اور شاہراہوں پر اس کی توقیر کو لوٹا اور کوئی جگہ ایسی نہیں چھوڑی جہاں عشق کے حسن کو داغدار نہ کیا گیا ہو۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ

خود نمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

دیکھنا بھی تو انہیں دُور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رُسوا کرنا

عشق ایک ایسی قوت ہے جو ذرّے کو آفتاب بنا سکتی ہے اور قطرے کو سمندر، کرن کو بقعۂ نور، شعلے کو شعلۂ جوالہ، فانی زندگی کو لافانی بنانے کی جو قوت عشق میں ہے اس کا اندازہ صاحبانِ قلب و نظر کو بڑی اچھی طرح سے ہے، جس نے علم سے محبت کی وہ عالم بن گیا اور دنیا اسے سلام کرنے لگی، جس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے عشق میں اپنی زندگی کے شب و روز گزار دیئے اسے

خلعتِ دوام عطا ہوئی، جس نے اعلائے کلمۃ الحق کے لئے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا اور اسے مردہ کہنا کفر ٹھہرا۔

ماہِ محرم عشق کی ایک نئی تعبیر پیش کرتا ہے۔ وہ عشق جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، وہ عشق جس کی شمع ہمیشہ روشن رہے گی، وہ عشق جو ہمیشہ توانائی اور قوت عطا کرتا رہے گا وہ عشق جو کفر کی اندھیری رات کو بقعۂ نور بنا دے گا۔

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لاالہٰ ہست حسینؑ

"بنائے لاالہٰ" بنا بازیِ طفلاں نہیں

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حضرت حسینؑ کی شہادت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس امر کی گواہی ہے کہ باطل مٹ کر رہے گا اور حق کا بول بالا ہوگا۔

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مگر یہ کربلا تو اب بھی موجود ہے، جگہ جگہ موجود ہے، پر کوئی حسینؑ موجود نہیں۔

ریگِ عراق منتظر، خاکِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؑ باز دِہ کوفہ و شامِ خویش را

قتلِ حسینؑ روز کا معمول بن گیا
دنیا میں آج بھی ہے حکومت یزید کی

حسینؑ اور یزید دونوں زندگی کے دو پہلو ہیں، دو قوتیں ہیں، ایک شر کی قوت اور ایک خیر کی قوت۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بو لہبی

چراغِ مصطفویؐ روشنی کی علامت ہے، عشق کی نشانی ہے، جاں سپردگی کی کیفیت ہے، ایثار اور قربانی کی اعلیٰ مثال ہے۔ شرارِ بولہبی کو ہمیشہ اس قوت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا اور یہ قوت اس شعلے کو بجھا دے گی لیکن چونکہ زندگی کو آگے بڑھتے رہنا ہے، ہر لحظہ نئے طور اور ہر لحظہ برق تجلی موجود رہنی ہے، اس لئے ابتلاء و آزمائش کا سلسلہ بھی لامتناہی ہے، ایسا ممکن نہیں کہ انسانی حوصلے اور قوت کو آزمائش سے نہ گزرنا ہو، اگر ایسا ہو تو انسانی اعضاء مضمحل ہو سکتے ہیں، زندگی کی روست پڑ سکتی ہے، روشنی کی قوت ماند پڑ سکتی ہے اور زندگی تو لامتناہی سلسلے کا نام ہے اور یہ لامتناہی سلسلہ زندگی کی جدوجہد کا مرہونِ منت ہے۔

چنانچہ عشرہ محرم اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش جاری رہے گی شاید یہی اقتضائے فطرت ہے، شاید یہی سرِ حیات ہے، شاید اسی سے انسان انسان بنتا ہے، شاید اسی سے شمعِ زندگی روشن رہ سکتی ہے اور یہی تنگ و تازِ جاودانہ زندگی کے سر کو کلاہ عطا کرتی ہے اور یوں زندگی نت نئی راہیں تراش لیتی ہے اور یہ سب کچھ شعلہ عشق سے ممکن ہوتا ہے۔ جب دنیا سے عشق اڑ جائے گا تو کچھ بھی تو باقی نہیں رہے گا ہاں کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

☆☆☆

قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

علامہ اقبال نے اپنے اس مصرعے میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف جس بلیغ انداز سے اشارہ کیا ہے اس سے اقبال کی گہرائیِ فکر اور فلسفیانہ نہج کا خوب خوب اندازہ ہوتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اقبال کا فکر اور فلسفہ دراصل اسلامی تعلیمات سے متاثر ہے اور ان کی تمام شاعری اسلامی روح کی ترسیل کیلئے وقف ہے، وہ ان قدروں، جذبوں اور اصولوں کا ابلاغ چاہتے ہیں جو انسان کو انسانِ کامل بنا سکتے ہیں، اس کے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور وہ اللہ کی مشیت کی جیتی جاگتی تصویریں بن سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن یعنی وہ شخص جو ایمان لے آیا ہے کہ اللہ سے بڑی طاقت کسی اور کی نہیں اور یہ کہ رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ، نجات دنیوی اور اخروی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ایسے اشخاص زندگی کے پرچم کو بلند کرتے ہیں اور کاروانِ حیات کی رہنمائی کرتے ہیں۔ قرآن پڑھنا کارِ ثواب ہے کیونکہ اسی طرح قرآن کی حفاظت ممکن تھی کہ وہ لوگوں کے ذہنوں میں، دلوں میں محفوظ ہو جائے اور اس کے خلاف ہر سازش ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دم توڑ دے لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ قرآن پڑھنا دراصل اس لئے فرض ہے کہ یہ اللہ کا اپنے بندوں کے نام پیغام ہے، یہ خالق کا اپنی مخلوق کے ساتھ تعلق کا ذریعہ ہے، یہ کہ اس میں وہ تمام اسرار و رموز پنہاں ہیں جو انسانی فوز و فلاح کے لئے نسخۂ کیمیا کی حیثیت رکھتے ہیں جو کہ رائی کو پہاڑ بنا سکتے ہیں، ذرے کو صحرا، قطرے کو سمندر اور انسان کو انسانِ کامل کی خلعت عطا کرتے ہیں، ایسا انسان جو اپنے لئے بھی فوز و فلاح کا منبع ہوتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی، جو ایسے چراغ روشن کرتا ہے جسے وقت کی آندھیاں کبھی بجھا نہیں سکتیں۔ لیکن بدقسمتی سے امتِ مسلمہ کی صورتحال کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہ ہو سکی۔ قرآنِ مجید کو خیر و برکت کا ذریعہ تو تصور کر لیا گیا لیکن اس سے رہنمائی اور ہدایت حاصل کرنے کی روایات

وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی چلی گئیں قرآن مجید کو پڑھا گیا، بار بار پڑھا گیا، ایک رات میں کئی کئی بار پڑھا گیا، ہزاروں نے پڑھا، لاکھوں نے سنا۔ لیکن کتنے ہیں جو اس کے پیغام کو سمجھ سکے، کتنے ہیں جن کی زندگیوں میں قرآن کی ہدایت اور اس کا پیغام رچ بس گیا۔ بہت سوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ قرآن مجید میں ان کا خالق انہیں کیا بتا رہا ہے، کیا سمجھا رہا ہے، وہ کون سے اسرار و رموز ہیں جن کے بل بوتے پر اسلام دنیا کی ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن کر ابھرا، جس نے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کو ملیا میٹ کر دیا، جس کے سامنے طاغوتی قوتیں دم توڑ گئیں اور مسلمانوں کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن گیا، جن کی زبان اللہ کی زبان ہو گئی، جن کے اشاروں پر دنیا کے معاملات طے ہونے لگے، جن کے احکامات جگہ جگہ سنائی دینے لگے، یہ معجزہ یہ کرشمہ، یہ جادو سر چڑھ کے بولا، صرف اس لئے کہ قرآن کی تعلیمات کو سمجھا گیا اور ان پر عمل ہوا اور پھر انسان نے وہ قوت حاصل کر لی کہ دنیائے کفر کو حیران و ششدر کر کے رکھ دیا۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے   جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا   سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

لیکن پھر کیا ہوا، بہت ہی بُرا ہوا، مسلمان قرآن کی تاویلات میں کھو گئے، اصل روح سے غافل ہو گئے اور اسوۂ محمد کو نظر انداز کر دیا، جو چلتے پھرتے قرآن تھے اور جن کی سنت اور احادیث آج بھی قرآن کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ قرآن عربی میں نازل ہوا اور ایسا وقت بھی آ گیا ہے کہ عربی ایک اجنبی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

قرآن کی زبان تو عربی ہے اور عربی سے ہمارا دُور کا تعلق بھی نہیں رہا پھر وہ وقت بھی آیا کہ قرآن کے فارسی اور اردو تراجم پیش کرنے پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا، کیا خوب ہوا کہ نہ تو زبان آتی ہے اور نہ ہی اس کا ترجمہ پیش کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن پھر اللہ کے نیک بندوں نے تراجم کا فریضہ سرانجام دے ہی دیا۔ لیکن کتنے ہیں جو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن ایک پیغام ہے، ایک لائحہ عمل ہے، ایک دستورِ حیات ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت سوں کو یہ نہیں معلوم کہ قرآن کا پیغام کیا ہے ہمارا رب ہمیں کیا کہہ رہا ہے، کس شے کا حکم دے رہا ہے اور کس سے منع کر رہا ہے؟ تو پھر ہم اسے کس طرح اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنا سکیں گے، کس طرح ہدایت حاصل کر سکیں گے اور کس طرح قرونِ اولیٰ کے مسلمان ایسی قوت اور صلابت حاصل کر سکیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو خود قرآن کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہونا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب قرآن کے مفاہیم اور مطالب ہم پر واضح ہوں۔ ایک بدقسمتی یہ بھی ہوئی کہ قرآن کی کچھ ایسی تاویلات کر دی گئیں کہ اُمتِ محمدیہ کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا، ہر شخص نے اپنی تاویل کی اور اس پر اَڑ گیا اور یوں گروہ بندیاں اور فرقے پیدا ہو گئے، امتِ محمدیہ ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو گئی، مفاد پرست علمائے سُو نے اس روش کو اور ہوا دی اور مسلمان کے خون بہانے کو عین مذہب بنا لیا گیا۔ ہماری رائے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن اپنے بندوں پر انتہائی آسان زبان میں نازل کیا۔ لیکن شومیِ قسمت سے ہم اسے تاویلات اور تشریحات کا گورکھ دھندہ بنا بیٹھے ہیں اور خود سمجھنے کی بجائے دوسروں پر انحصار کرنے لگے ہیں جو اپنی مرضی کے تراجم اور تشریحات کرنے لگے ہیں تا کہ ان کی چاندی بنتی رہے اسلام کا بول بالا ہو یا نہ ہو ان کا بول بالا ہوتا رہے، ان کے محلات تعمیر ہوتے رہیں، ان کے مریدوں کی تعداد بڑھتی رہے اور ان کی سلطنت قائم رہے، چاہے اسلامی سلطنت تباہ و برباد ہو کر رہ جائے، اغیار کی محتاج ہو جائے، تمسخر کا نشانہ بن جائے اور نیست و نابود ہو جائے۔ ہماری رائے میں اپنی دنیوی اور اخروی فوز و فلاح کے لئے ہمیں قرآن حکیم سے رشتہ جوڑنا ہوگا، اسے سمجھنا ہوگا، اس پر عمل کرنا ہوگا، صرف اسی طرح ہم ایک بار پھر ایک قوت بن کر ابھر سکتے ہیں اور کفر کی سازشوں کو نیست و نابود کر سکتے ہیں اور اسلام کا بول بالا کر سکتے ہیں، اپنی زندگیوں میں خوشیاں لا سکتے ہیں اور اطمینان اور سکون کی نعمت سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں، یقیناً ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

''سفر،سفر ہے یہاں گھر کی راحتیں مت ڈھونڈ''

اقبال نے کہا تھا کہ ''ہر شے مسافر ہر چیز راہی''ان کے خیال میں ہر چیز سفر میں ہے، آگے بڑھ رہی ہے،چلتی جا رہی ہے اور چلنا ہی شاید منشائے حیات ہے،خواہش ایزدی بھی ہے، تقاضائے فطرتِ انسانی بھی ہے اور یہی شاید زندگی کے ارتقاء کا راز بھی ہے ۔اگر اشیاء رُک جائیں،حرکت مسدود ہو جائے،ارتقاء معطل ہو جائے تو زندگی ختم کر رہ جاتی ہے، چلتے رہنا، کچھ کرتے رہنا اور تغیر آشنا ہونا ہی اساسِ زندگی ہے اور کہیں بھی تکمیل اور ٹھہراؤ ممکن ہی نہیں ۔مجھے امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی لائنز یاد آ رہی ہیں۔

The woods are lovely, dark and deep.
But I have promises to keep,
And miles to go before I sleep,
And miles to go before I sleep.

گویا sleep نیند یا ٹھہراؤ موت کی علامت ہے زندگی تو چلنے اور مسلسل چلتے رہنے کا نام ہے۔

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسی زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

(پیامِ مشرق (زندگی و عمل) کلیاتِ اقبال فارسی ص ۔۲۸۰)

ساحل نے اپنے آپ سے کہا کہ میں جانے کب سے کھڑا ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں کہ میں کون ہوں جب یہ بات موج نے سنی تو اس نے حرکت کرنا شروع کر دی اور بولی اگر میں چلوں تو میں زندہ ہوں نہ چلوں تو کچھ بھی نہیں،حرکت کا یہ تصور کوئی فلسفیانہ موشگافی نہیں بلکہ ناقابلِ تردید حقیقت پرمبنی ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ایک ہم ہی کیا یہ پوری کائنات ابھی تک نامکمل ہے اور تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہے اور پھر ہم قناعت، گوشہ نشینی اور بے حرکتی کیوں اختیار کر لیں، بہت ہو گیا بہت کر لیا، کچھ کیا گیا ہے پھر بھی کرنے کو جانے کیا کچھ پڑا ہے اور یہ کرنے کا عمل کوئی آسان کام بھی نہیں، بہت ہی جان لیوا دشوار گزار اور کٹھن ہے ۔ایک جگہ بیٹھ رہنا اور پھر خاک کا ڈھیر بن جانا شاید کسی کو گوارا نہ ہو اور اگر کسی کو گوارا ہو بھی تو ہمیں گوارا نہیں،اللہ کو پسند نہیں،اس کے نبی کی خواہش نہیں ۔ہمارا آج کل سے بہتر ہونا چاہیے اور آنے والا کل آج سے بہتر ہو تو بات بنتی ہے،یہ ہے ارتقائے حیات،یہ ہے زندگی کی علامت،یہ ہے برگساں کا Elan Vital اور یہ ہے اقبالؒ کا جوشِ حیات ۔تمام انبیاء، صالحین اور مصلحین اسی خواہش کے پیشِ نظر سراپا کوشش بنے رہے ہیں،جدوجہد کرتے رہے ہیں،انہیں بے انتہا مشکلیں آئیں،ان کی کمرِ ہمت توڑنے کی کوشش کی گئی لیکن انہوں نے اس کی پروا تک نہیں کی،ان کی مخالفت ہوئی،انہیں قتل کیا گیا،انہیں زہر کا پیالہ پینا پڑا،سولی پر چڑھنا پڑا، خنجر سہنے پڑے لیکن ان کا ایک ہی مشن تھا ایک ہی راہ تھی،خوب سے خوب تر کی تلاش۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

لیکن نظر کہیں ٹھہر ہی نہیں سکتی کیونکہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہی زندگی ہے،کیٹس نے کہا تھا:

“Heard melodies are sweet, but those unheard are sweeter”

دُور کے ڈھول ہمیشہ سہانے لگتے ہیں اور یہ کوئی بُری بات بھی نہیں ۔مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ تم بینائی کھو بیٹھے ہو، کچھ نہیں کر سکو گے، بیٹھ رہو،اللہ اللہ کرو لیکن شاید مجھے معلوم تھا کہ کوشش اور جہدِ حیات کا عمل بھی اللہ اللہ کرنے کا عمل ہے کیونکہ اللہ چاہتا ہی یہی ہے کہ سعی پیہم اور جہدِ مسلسل کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا جائے ۔میری کتنی خواہش تھی کہ چلو میں میٹرک تو کر لوں لیکن جب میٹرک پاس کر لیا تو لگنے لگا کہ ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے،کاش میں بی اے کر لوں ۔جب بی۔

اسے ہو گیا تو لگا کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا، پھر جو کچھ کرتا رہا اللہ کا شکر ضرور کیا، پھر یہ سوچا کہ منزل تو بہت دور ہے ابھی تو بہت دور جانا ہے اور ایک موقع پر یہ شعر بھی ہو گیا۔

مجھے ہر لحہ چلنے کا ہنر دے　　مری منزل خدایا دور کر دے

جب منزل مل جاتی ہے تو منزل میں لطف ہی باقی نہیں رہتا، منزل تو زندگی کا اختتام ہے، آگے بڑھتے رہنا ہی زندگی ہے لیکن یہ بات یاد رہے کہ سفر کے اس عمل میں مشکلیں آنا ہوتی ہیں، آ کر رہتی ہیں بقول شاعر یہ ممکن ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جہاں شجرِ سایہ دار ہوتے ہیں وہاں چلچلاتی ہوئی دھوپ بھی موجود ہوتی ہے، جہاں نخلستان اور گلستان راہ میں آتے ہیں وہاں لق ودق صحرا، بے کراں سمندر اور پہاڑوں کے جان لیوا سلسلے بھی موجود ہوتے ہیں۔ بس مسافر کو سفر کی لگن ہونی چاہیے آگے بڑھتے رہنا چاہیے کہ یہی زندگی ہے یہی بندگی ہے Shakespeare کا ایک کردار کیا خوب کہتا ہے:

Men must endure their going hence,

even as their coming hither; ripeness is all.

یعنی پک جانا ہی کافی ہے تجربے سے مالا مال ہونا ہی بہت ہے اور یہی سب کچھ ہے اس لئے زندگی کو ایک مسافر خانہ کہا گیا ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ ہمیں یہاں قیام کرنا ہے۔ بلکہ نہیں، ہمیں تو چلتے رہنا ہے، چلتے ہوئے بھی، بیٹھے ہوئے بھی، سوتے ہوئے بھی، لکھتے ہوئے بھی اور پڑھتے ہوئے بھی ہمیں نت نئی دنیائیں تراشنا ہوتی ہیں، نت نئے میدانوں کی تلاش ہوتی ہے اور ایسے میں منزلوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی۔ سفر دل کش بن جاتا ہے اور ہمسفر اور بھی زیادہ دل کش۔

منزلوں کی بات چھوڑو کس نے پائیں منزلیں　　اک سفر اچھا لگا اک ہم سفر اچھا لگا

عقل کی منطق جدا ہے دل کی منطق اور ہے

دماغ اور دل دو شعری استعارے بھی ہیں اور سائنسی حقیقتیں بھی، دل و دماغ کو ایک دوسرے کا حریف پیش کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری تو دل و دماغ کی باہمی آویزش کی ایک حد تک نہایت موثر آئینہ دار ہے۔ سائنس دان کہتے رہیں کہ دل تو محض ایک خون کو رگوں میں دوڑانے کا ذریعہ ہے لیکن شاعر یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ان کے نزدیک

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں　　روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دل کہ یک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش　　ایک عالم کے سر بلا لایا

دل کی بلاخیزیاں اور قیامتیں دیدنی اور شنیدنی ہیں، یہ دل یہ کافر دل انسان کو بےکل رکھتا ہے، بے سکون رکھتا ہے، بےقراری عطا کرتا ہے، مگر یہی دل اگر چاہے یا خوش ہو جائے تو جسم و جاں وہ راحت محسوس کرتا ہے، وہ سکون اور چین انہیں نصیب ہو جاتا ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، کسی نے کہا " آج تو میرا دل بہت ہی اداس ہے"، دوسرا بولا "دل جینے نہیں دیتا" تیسرا بولا" کلیجہ موہنہ کو آ رہا ہے" اور کسی نے کہا "دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہو" بہرحال میں دل کے اس متصوفانہ پہلو سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اتنا کہوں گا کہ جسے ہم دل کہتے ہیں یا جسے دل سمجھتے ہیں" وہی ہمارا دن ہے وہی ہماری رات، وہی پھول کھلا دیتا ہے وہی کانٹوں سے ہماری جھولیاں بھر دیتا ہے، حکماء نے دل کو فکر اور ادراک سے بھی مماثل قرار دیا ہے، لیکن دل کی سوچ نویلی سوچ ہوتی ہے۔ اسے ماحول سے کیا لینا دینا، اسے بہار کی رنگ رلیوں سے کیا غرض، اسے طاؤس ورباب سے کیا علاقہ، یہ آہ و زاری کیا جانے، یہ نالہ و شیون کی کیا پرواہ کرے، اس کے تو اپنے اندر ایک جنت آباد ہے جس کی کوئی مثال نہیں اور اسی طرح ایک جہنم ہے جس سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔ قارئین یہ لفظی طوطا مینا نہیں بلکہ حقیقت سے

بہت بڑی حقیقت ہے۔

سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی　　دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی
دل گلستاں تھا تو سب عالم پہ چھائی تھی بہار　　دل بیاباں کیا ہوا عالم بیاباں ہو گیا
دلوں کی اپنی منطق ہے دلوں کو کون سمجھائے　　پلٹ جاتی مری کایا، یہ کافر دل نہیں مانا
دل تو میرا اُداس ہے ناصؔر　　شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

یہ کافر دل، یہ باغی قطرۂ خوں، یہ انقلابی علم بلند کئے ہوئے جب نکلتا ہے تو بساط ہی پلٹ دیتا ہے۔ اسی گوشت کے لوتھڑے کی جانب خلاقِ اعظم نے بھی اشارہ کیا ہے کہ اس کی حفاظت کیجئے۔ جدید دور میں بھی دل کو نہایت اہم تصور کیا جاتا ہے اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اصل محرک تو دماغ ہے لیکن کیا کیجئے کہ دل نے دماغ میں بھی بستیاں آباد کر لی ہیں، شہر بسا لئے ہیں اور یدِ اعظم دریافت کر لئے ہیں، جدید حکما اور سائنس دان دماغ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک حصے کا تعلق جذب وشوق سے قرار دیتے ہیں اور دوسرے کا تعلق عقل وخرد سے۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ سینے سے نکل کر دل دماغ میں فٹ ہو گیا، حکماء کی حکماء جانیں ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ دل جہاں بھی ہو دل ہی ہوتا ہے اور انسان اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا، جون ڈن نے کہا تھا۔ ”اے دل میں تجھے محبوب کے پاس چھوڑ کر لندن جا رہا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ ایک ہفتے کے بعد محبوب کی تلوّن مزاجی سے تنگ آ کر تُو میرے پاس آ جائے گا“ مرزا غالبؔ دل کو کہیں رکھ کر بھول آئے تھے، ایک مرزا صاحب پر ہی کیا موقوف احمد ندیم قاسمی کہہ اٹھتے ہیں۔

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا　　میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

قارئین کرام! دل انسان کے لطیف احساسات کا نام ہے، اس کے جذب وشوق سے موسوم ہے، اس کی آوارہ خرامی اور خیال آفرینی سے منسلک ہے سوچئے! اگر یہ دل نہ ہوتا تو انسان ایک روبوٹ ہوتا ہے، مشین کا پرزہ ہوتا، لکڑی کا ٹکڑا ہوتا، لوہے کی سلاخ ہوتا، جانے کیا کیا کچھ ہوتا مگر انسان نہ ہوتا۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

آپ سوچیں گے کہ میں نے دل کو کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھا لیا ہے، صاحبو! میں نے کب چڑھایا ہے وہ تو خود چڑھ گیا ہے، وہ اتنا منہ زور ہے اور اتنا طاقتور کہ اس سے مفر ممکن ہی نہیں اور اگر مفر کیجئے گا تو الامان والحفیظ۔ کیا کیا قیامتیں ٹوٹیں گی، دل گیا تو سب کچھ گیا۔ پھر ڈپریشن مایوسی اور اداسی آپ کا مقدر بن جائے گی۔ آپ سکون کے لئے کوئی گوشہ تلاش کرتے پھریں گے لیکن آپ کو خدا کی زمین تنگ نظر آئے گی۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب　　ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے زیادہ ہی شعر نقل کر دیئے ہیں پر کیا کیجئے کہ یہ سب دل کی اولاد ہیں، جذبوں کے نونہال ہیں، احساسات کے پروردہ ہیں اور لطافتوں کے آئینہ دار ہیں، ان سے مفر ممکن ہی نہیں، مانا کہ دماغ کی بھی بڑی اہمیت ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا دل بھی تو دماغ کا حصہ ہے اور بڑا معتبر حصہ، اس لئے جو دل کہے مان لیجئے۔ ہاں! کبھی کبھی اسے سمجھانے کی بھی کوشش کیجئے، سمجھ جائے تو اس کا کرم، نہ سمجھے تو گھٹنے ٹیک دیجئے، اگر گھٹنے نہ ٹیکے تو وہ خود بخود ٹک جائیں گے۔ دل کی ایک دھمکی سب کچھ ختم کر کے رکھ دے گی، سارے ارادے سارے عزائم اور سارے حوصلے دم توڑ دیں گے۔ گھبرایئے نہیں! دل زندگی ہے اور زندگی دل ہے اس دل نے بڑے بڑے کام کروائے ہیں جو کام دل سے کیا جائے وہی کام ہوتا ہے باقی بیگار یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں کسی صورت ممکن نہیں۔ ذرا اپنے دل میں جھانک کر دیکھئے جواب مل جائے گا۔

☆☆☆

ہر گھڑی خونِ تمنا نہیں دیکھا جاتا

جب شاخِ دل پر تمناؤں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں، جب روح کے آنگن میں گلہائے گوناگوں مہکتے ہیں، جب تیرہ و تار راتوں کے بعد صبحِ نو اپنے اُجالے بکھیرتی ہے، جب زندگی خوشیوں سے جھولیاں بھر دیتی ہے، جب روٹھے ہوئے آملتے ہیں، جب پیار کی دیوی مہربان ہوتی ہے، عشق کے نغمے فضاؤں میں گنگناتے ہیں تو کتنا لطف آتا ہے، لگتا ہے زندگی کسی جنت سے کم نہیں۔

کہتے ہیں جس کو جنت فقط اک ادا ہے تیری
باقی سب شاعروں کی رنگیں بیانیاں ہیں

زندگی کی شوخ ادائیں، چنچل انداز، مدبھرے لمحات کتنے دل خوش کن ہوتے ہیں لطف ہی لطف ہوتا ہے۔ زندگی میں ایسا لگتا ہے کہ زندگی ہمیشہ یونہی مسکراتی رہے گی، وصل کی لذتوں سے زندگی یونہی فیض یاب ہوتی رہے گی لیکن جب اچانک کوئی حادثہ رونما ہوتا ہے تو سارے خواب ملیا میٹ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تو تا حدِ نظر یاس کا ایک لق و دق صحرا ہوتا ہے، نہ کوئی پھول، نہ کوئی کلی، نہ لب و عارض کی جنت، نہ گیسوؤں کی ٹھنڈک ــــ کچھ بھی تو نہیں، ایسا لگنے لگتا ہے کہ کچھ تھا ہی نہیں، کبھی کچھ ہوتا ہی نہیں، واہ رے حضرتِ انسان تیرے کیا کہنے، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشا، گھڑی میں شاداں و فرحاں، گھڑی میں اداس و ملول، شاید یہی تلون انسان کو انسان بناتا ہے۔ وگرنہ انسان کی آرزوئیں تو اسے دیوتا بنانے پہ تلی ہوئی ہوتی ہیں۔

موت نے کر دیا لاچار وگرنہ انساں
تھا وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

یہ موت بھی عجب شے ہے، کچھ ہونے ہی نہیں دیتی، سب کچھ تھم کے رہ جاتا ہے، سب

کچھ رُک جاتا ہے۔

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری میری موت سے نہ ہوگی میرے غم کی ترجمانی

یا پھر اقبال جیسا البیلا کہہ اٹھتا ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

کارِ جہاں لاکھ دراز ہوا کرے، منشائے ایزدی کو انتظار کی عادت نہیں، اسے تو کن فیکون چاہیے۔

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

غالب کو تو شاید ہر لحہ موت کا دھڑکا لگا رہتا تھا اور سچ ہی لگا رہتا تھا، کسے علم ہے کہ اگلا پل اس کی زندگی میں آئے گا یا نہیں۔ بس اس قسم کے خیالات بعض اوقات کوہِ ہمالیہ کو بھی شق کر دیتے ہیں، پربت کو رائی بنا دیتے ہیں، سمندر قطرے میں سمٹ جاتا ہے اور پھر دل کو تسلی دینے کے لئے شاعر کہہ اٹھتا ہے۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

دریاؤں اور سمندروں میں اتر جانے والا قطرہ لاکھ ڈینگیں مارے اس کا نہ کسی نے سراغ لگایا ہے نہ لگا سکا ہے۔ میرا اپنا نقطۂ نظر اکثر و بیشتر رجائی رہا ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ رجائیت کے معنی کیا ہیں لیکن پھر بھی بعض واقعات ہلا کر رکھ دیتے ہیں، وطنِ عزیز میں جو کچھ ہر پل ہو رہا ہے وہ رجائیت کے پرخچے اڑانے کے لئے کافی ہے لیکن پھر بھی حکمِ ربی ہے۔ **لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ** "اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہونا"۔ مولا! ہم تیری رحمت سے ناامید نہیں لیکن جو کچھ شب و روز ہو رہا ہے، جس طرح خاک و خون کا کھیل کھیلا جا رہا ہے، اس سے دل کانپ کانپ جاتا ہے، آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور امید ساتھ چھوڑنے لگتی ہے لیکن یہ بہت اچھا ہے اور اس کی دین ہے کہ وقت بڑے بڑے زخموں کو بھر دیتا ہے۔ زندگیٔ مختصر میں ایسے ایسے زخم لگے کہ جس کے بیاں کی قلم کو طاقت نہیں، حرف میں قوت نہیں لیکن پھر بھی آہستہ آہستہ سب کچھ

نارمل ہوگیایا ہوتا چلا گیا۔حال ہی میں میرا اپنا انتہائی پیارا دوست مسعودالرحیم لون اللہ کو پیارا ہوگیا اور اپنی یادیں چھوڑ گیا، جانے کتنے مسعودالرحیم روز اپنے پیاروں کو چھوڑ جاتے ہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ سب کچھ نارمل ہونے لگتا ہے اور ہم کہہ اٹھتے ہیں۔

"ہر گھڑی خونِ تمنا نہیں دیکھا جاتا"

لیکن یہ تو سدا ہوتا آیا ہے اور سدا ہوتا چلا جائے گا،اس طرح کے زخم روح اور جسم پر اس طرح سے لگتے ہیں کہ پھر روح اور جسم اس کے عادی ہو جاتے ہیں، ڈھیٹ ہو جاتے ہیں، پتھر بن جاتے ہیں، بے حسی جذبوں کو نگل لیتی ہیں،آرزوئیں خون کے دریا میں تحلیل ہو جاتی ہیں، لیکن پھر ایک صبح طلوع ہوتی ہے،ایک امید جنم لیتی ہے،ایک آرزو پھوٹتی ہے،ایک خواہش بیدار ہوتی ہے،ایک تمنا انگڑائی لیتی ہے،ایک خواب دل کش پیکر میں نمودار ہوتا ہے اور زندگی اپنی پرانی ڈگر پر چلنے لگتی ہے اور یہی زندگی ہے، یہی نیرنگی ہے،ہمیں یہی حکم ہے کہ ہم برداشت کرتے جائیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ کسی کو کسی کی طاقت سے زیادہ اذیت میں نہیں ڈالتا۔شاید ہم زیادہ ہی نازک ہو گئے ہیں۔شاید یہ ہمارا ہی قصور ہے کہ ہم حقیقتوں سے انکار کرنے لگتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حقیقتیں ہمیں چت گرا دیتی ہیں اور ہم مان لیتے ہیں کہ انسان بالآخر انسان ہے دیوتا تو نہیں ،اس لئے اسے خونِ تمنا کو دیکھنے کی سکت پیدا کرنی چاہیے، حوصلہ کرنا چاہیے،امید کا دامن تھامے رکھنا چاہیے صرف اور صرف اسی طرح اس کے جسم اور روح پر لگے کاری زخم بھر سکتے ہیں اور اس میں جینے کا حوصلہ پیدا ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

دل کی لگی، لگی رہی، ختم فسانہ ہوگیا

ہم دل کی باتیں کرتے نہیں تھکتے، جو دل میں آئے کر گزرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ہم دل کی لطافتوں، لذتوں اور شیرینی کے بھی قائل ہیں، کہتے ہیں کہ دل ایسا ظالم حاکم ہے جس کے سامنے تمام اعضاء محکوم ہو جاتے ہیں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، کورنش بجالاتے ہیں۔کیا مجال کہ کوئی عضو ذرہ برابر بھی سرتابی کرے، دل کے حضور پورا جسم حاضر ہوتا ہے، جانے دل کی خاطر کیا کیا قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے، دل حکم دیتا ہے اور جسم عمل پیرا ہو جاتا ہے۔یہ سب کچھ ہم کہتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں لیکن شاید بلکہ یقیناً ہزاروں ایسے معاملات ہیں کہ جسم دل سے بغاوت کرتے ہیں، دل کی ایک نہیں سنتے اور مصلحت کے دیوتاؤں، مفاد کے خداؤں، حاجات کی دیویوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں،ان کی پوجا پاٹ میں ہمہ تن محو رہتے ہیں۔دل کہتا ہے،بار بار کہتا ہے"ملک جل رہا ہے"،"قوم برباد ہو رہی ہے"،"اتحاد پارہ پارہ ہے"۔"دشمن کی یلغار ہے"،"غنیم کی افواج میں سازشیں ہیں"،"زندگی آخری سانس لے رہی ہے"لیکن پھر بھی ابھی تک اور جانے کیوں ابھی تک ہم دل سے بغاوت کرتے دکھائی دیتے ہیں،ہمیں احساس تک نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے ماسٹر مائنڈ ہم خود ہیں، یہ سازشیں تو ہم نے خود تیار کی ہیں،ہم تو خود اپنے باغی ہیں۔وطنِ عزیز آزاد ہوگیا، ہزاروں گھر لٹے ،لاکھوں تباہ و برباد ہوئے، گھر سے بے گھر ہوئے صرف ایک بڑے گھر کی تلاش میں،ایک ایسے آنگن کی تلاش میں، جہاں برگد کے نیچے بیٹھ کر ہم پیار اور محبت کی باتیں کر سکیں گے،ایک دوسرے کا دکھ سکھ سن سکیں گے،لیکن قیام پاکستان کے فوراً بعد بالکل فوراًبعد، جنہوں نے مہاجرین کے کیمپوں کا دورہ کیا ان کے منہ سے نکلا"یا خدا"چیخیں بلند ہو گئیں، عصمتوں کی حفاظت کرنے والے عصمتیں لوٹنے لگے، پھر گھر چھوڑنے والے جب گھروں کی تلاش میں نکلے تو وہ یہ دعوے کرنے لگے کہ وہ تو محلات میں رہتے تھے،انہیں محلات

ملنے چاہئیں، انہیں محلات مل گئے، سب کو تو محلات نہیں مل سکتے تھے، جو محلوں میں رہتے تھے انہیں جھونپڑیاں نصیب ہوئیں اور جن کے چھوٹے چھوٹے مکان اور چھوٹے چھوٹے کاروبار تھے انہوں نے فی الفور بڑے بڑے مکانوں، بڑی بڑی دکانوں پر قبضہ کرلیا اور گھر چھوڑ کر آنے والے منہ دیکھتے رہے گئے۔ یہ جو یہاں ریڑھیاں لگاتے تھے بڑے پلازوں کے مالک ہو گئے، بڑے بڑے سینما گھر بنا لئے، فیکٹریاں لگائیں، جاگیردار بن گئے اور جو جاگیردار تھے وہ امیر سے امیر تر ہو گئے، ملک کی تقدیر کے مالک بن بیٹھے کوئی وزیر کوئی امیر کوئی شہریار کوئی شہنشاہ اور پاک دھرتی کی وہ مٹی پلید کی کہ آسمان خون کے آنسو رونے لگا، سازشوں کا جال بچھ گیا، قائدِ اعظم کی جان گئی، قائدِ ملت گولیوں کا شکار ہوئے، پھر کیا ہوا وہ سب کچھ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا، لاہور میں مارشل لاء نافذ ہو گیا، قحط نے آن گھیرا۔ کہیں نمک کا قحط، کہیں چاول کا اور انسانوں کا قحط تو اس طرح پڑا کہ کہیں کہیں کوئی انسان اگر دکھائی بھی دے جاتا تو لگتا کہ اسے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، ایسے میں عساکرِ پاکستان نے وہ کچھ کرنے کی کوشش کی جو سیاستدانوں کو کرنا چاہئے تھا۔

"جس کا کام اسی کو ساجھے
دوجا کرے تو ٹھینگا باجے"

اہلِ تیر و تفنگ نے قلم و قرطاس کا کام سنبھالا اور قلم و قرطاس کے دھنی روپوش ہونے لگے۔ پھر جو کچھ وطنِ عزیز کے ساتھ ہوا وہ ہم سب کو معلوم ہے لیکن شاید کسی کو بھی اس کا احساس نہیں، بس ہم ہیں کہ تقریریں کئے جاتے ہیں، حکم صادر کئے جاتے ہیں، فتوے جاری کئے جاتے ہیں لیکن اپنی ذات اور اپنے کردار کے کھنڈرے پن سے مطلقاً ناواقف!

کبھی کبھی دل جاگ اٹھتا ہے، روح چیخ اٹھتی ہے مگر پھر سیم و زر کی چمک دمک انہیں سلا دیتی ہے۔ ہم روح کی عظمت رفتہ اور بلندی کا ذکر کرنے لگتے ہیں تو جسمانی لذتیں اور حلاوتیں آڑے آجاتی ہیں، ہم انصاف کی بات کرتے ہیں تو دولت کی ریل پیل ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور انصاف کا ترازو ڈگمگانے لگتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ شہروں میں امن ہو، سکون ہو، آشتی ہو، بھائی چارہ ہو لیکن اس کا آغاز ہم اپنی ذات سے کرنا نہیں چاہتے، کسی نے ذرا سی بات ہماری مرضی کے خلاف کہہ دی ہم نے گھونسا دے مارا۔ ہم نے ایسے عقائد اور ایسے فرقے بنا لئے ہیں جس کا قرآن اور سنت سے دُور کا بھی تعلق نہیں، ہم رحمت اللعالمینؐ کے گن گاتے ہیں مگر اپنے مخالفوں پر، اپنے آپ سے اختلاف کرنے والوں پر قہر بن کر ٹوٹتے ہیں، کسی کی کیا مجال کہ وہ میرے خیال سے، میری رائے سے اختلاف کرے، اگر اس نے اختلاف کیا تو وہ کافر و زندیق ہے، گردن زدنی ہے، کافر دل سمجھاتا ہے کہ سب کچھ غلط ہے، سب بھائی بھائی ہیں، سب اہلِ وطن ہیں لیکن کوئی مومن ذہن بھلا کافر دل کی کیوں سنے؟ بظاہر دل سے ہمیں رشوت، بد دیانتی، ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ سے نفرت ہے لیکن اپنی ذاتی زندگی میں ہم ان تمام صورتوں کو اللہ کی دین سمجھتے ہیں، اس کی عنایت سمجھتے ہیں، جس کے باعث ہم پیدل چلنے والے اب کاروں میں چلتے ہیں، جھونپڑیوں میں رہنے والے کوٹھیوں میں رہے ہیں، محنت و حلال روزی کمانے والے پریشان حال ہیں، تنگ دست ہیں لیکن بے بس ہیں۔ سنتے ہیں اور ہم خود بھی کہتے ہیں کہ ہم پہ خدا کا عذاب ٹوٹ پڑا ہے۔ ہم قحط کی زد میں ہیں لیکن عملی زندگی میں ہم وہی کچھ ہیں جو ہم رہنا چاہتے ہیں، اگر ذرہ سا بھی شک ہو تو کچہریوں، دفتروں، مارکیٹوں، سکولوں، ہسپتالوں اور ہوٹلوں میں جا کر دیکھ لیجئے، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہماری قوم کتنی دیانتدار ہے اور کتنی فرض شناس۔ اس نے اپنی تباہی اور بربادی سے کیا کچھ سیکھا ہے، کتنا سیکھا ہے؟ شاید بہت کم، شاید کچھ بھی نہیں۔ شاید اس لئے کہ ابھی بُرے دن نہیں آئے اور ہماری خواہش ہے، ہمارے اعمال کی خواہش ہے کہ ایک کربلا برپا ہو، سقوطِ بغداد ہو، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر ہماری آنکھیں بند ہیں، ہمارے دماغ شل ہیں۔ ہم دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنی بھڑاس نکال لیتے ہیں اور اپنے فرض کی ادائیگی کر لیتے ہیں ہم پر افسوس ہے۔۔۔۔ صد افسوس!

☆☆☆

پاک سرزمین شادباد

حفیظ جالندھری کی روح کتنی خوش ہوتی ہوگی جب اس کا یہ قومی نغمہ فضاؤں میں گونجتا ہوگا اور کون سا لمحہ ہے، کون سی گھڑی ہے جب یہ نغمہ فضاؤں میں گونج رہا نہیں ہوتا، کبھی ٹیلی ویژن پر، کبھی ریڈیو پر، کبھی سکول میں، کبھی کسی ادارے میں، کبھی کسی تقریب کے آغاز میں، کبھی کسی تقریب کے اختتام پر اور کبھی کسی قائدِ مملکت کی تقریر کے شروع میں اور جانے کہاں کہاں، یہ ترانہ جس کا صرف ایک لفظ (کا) اردو کا ہے سب کو اس طرح یاد ہو گیا ہے کہ جیسے یہ ان کی اپنی زبان میں ہو، بہت سے بچے اور بڑے ترانے کے تمام مفہوم اور مطالب سے بھی واقف نہیں ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک دعا ہے جو بظاہر دل سے نکلتی ہے کہ اے پاک سرزمین! خوش رہ تو ہمارے حسین ماضی اور خوبصورت مستقبل کی ضامن ہے، تو ہم پر اللہ کا احسان ہے جانے کیا کیا یادیں اور باتیں ہیں جو اس مختصر سے ملی نغمے سے منسلک ہیں لیکن صاحبو! پاکستان کوئی مجرد شے نہیں، کوئی محض خیالی دنیا نہیں، کوئی خواب وخیال نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جس سے ۱۸ کروڑ نفوس کی خوشیاں اور غم منسلک ہیں، ہم اس قومی ترانے میں دعا کسی خیالی پیکر کے لئے نہیں مانگ رہے ہوتے اگر ایسا ہے تو پھر اس ملی نغمے کا مفہوم ہی ختم ہو کر رہ جاتا ہے دراصل یہ دعا تو اہلِ وطن کے لئے ہوتی ہے، اپنی پاک دھرتی کے پاک باسیوں کے لئے ہوتی ہے اپنے لئے ہوتی ہے اپنے بچوں اور بزرگوں کے لئے ہوتی ہے، دعا یہ ہوتی ہے کہ اللہ ہم سب کو ہر بلا سے محفوظ رکھے جس مقصد کے لئے ہم نے یہ دھرتی ہندوؤں، انگریزوں اور بعض مسلمانوں سے لڑ جھگڑ کر لی تھی، اس دھرتی کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان دشمن کے شر سے محفوظ رہیں اور انتہائی خضوع وخشوع کے ساتھ اپنے رب کے احکام بجالائیں اور رب کو جتنی اپنی مخلوق سے محبت ہے اس کا اندازہ ایک حد تک ہم سب کو ہے کہ وہ ستر (۷۰) ماؤں سے زیادہ ہم سے پیار کرتا ہے، ہمیں ذرا سا دکھ آئے اور ہم

دستِ دعا دراز کریں تو اس کی رحمت جوش میں آجاتی ہے "تم اگر زمین سے آسمان تک تمام فضا گناہوں سے بھر کر بھی لے آؤ اور دل سوزی سے مجھ سے کچھ مانگو تو میں تمہیں دوں گا" یہ ارشاد ہے ہمارے خالق کا، ہمارے رب کا جس نے ہمیں اچھی مٹی سے تیار کیا، اچھے انداز سے تیار کیا اور پھر ان پر رحمت کے کیا کہنے جو اس کے اور اس کے نبیؐ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی خواہش رکھتے ہوں ان کے لئے تو اس کی رحمتیں ہیں فضل ہی فضل ہے تو پھر اگر کوئی اس کی اسی مخلوق کو تکلیف پہنچائے، اس کا سکون غارت کرے، اس کے مال، اس کی عزت اور آبرو سے کھیلے تو اس کا غیض اور اس کا غضب کتنا شدید ہوتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں چنانچہ جب ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ اے پاک سرزمین تو خوش رہ، تو ہماری دراصل دعا یہ ہوتی ہے کہ اے اس دھرتی کے باسیو تم خوش رہو، چاہے تمہارا کسی مذہب، کسی عقیدے یا مسلک سے تعلق ہو۔۔۔تم خوش رہو۔ اگر ہم نے پاکستان اسلام کے لئے حاصل کیا تھا تو اسلام تو سراپا سلامتی ہے۔ سراپا محبت ہے، سراپا اخوت ہے، ہمدردی اور محبت کا ایک بحرِ زخار ہے جو سب کو سیر کرتا ہے، سب کی پیاس بجھاتا ہے، سب کو اپناتا ہے، سب کو گلے لگاتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ۲۳ سال میں لاکھوں انسان مشرف بہ اسلام نہ ہوتے اور دیکھتے ہی دیکھتے چہار دانگِ عالم میں اسلام زندہ باد کا نعرہ بلند نہ ہوتا۔

پر وطنِ عزیز میں کیا ہو رہا ہے، ہم کیا کر رہے ہیں؟ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں، ہمارے مقاصد کیا ہیں، ہمارا نصب العین کیا ہے، یہ شاید ہم سب جانتے ہیں یا شاید نہیں جانتے اگر نہیں جانتے تو جاننے کی سخت ضرورت ہے اور اگر اب نہیں جان پائیں گے تو پھر کب جان پائیں گے؟ خدا جہاں بڑا رحیم وکریم ہے، بڑا قہار اور جبار بھی ہے، جب کوئی قوم اس کی مشیت کو پورا نہیں کرتی تو وہ کوئی اور قوم لے آتا ہے ایسا ہوتا آیا ہے اور ایسا ہوتا رہے گا۔ کیوں نہ ہم کبھی تنہائی میں بیٹھیں، اپنے دل سے گفتگو کریں، اپنے اللہ سے لو لگائیں، اس کے نبیؐ کی شخصیت پر غور کریں، قرآن کے مفاہیم کو سمجھیں، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو شاید یہ حقیقت

روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ ہم روشنیوں کو اندھیروں میں تبدیل کر رہے ہیں۔ صبحِ امید کو شامِ فراق میں بدل رہے ہیں۔ پھولوں کو کانٹوں کا پیراہن پہنا رہے ہیں خوشبو کو عفونت میں تبدیل کر رہے ہیں بلکہ خود اپنی زندگی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کر رہے ہیں۔ جب ہم کسی کا سکون لوٹیں گے۔ کسی کی جان کے درپے ہوں گے، کسی کی آبرو ریزی کریں گے تو ہم کب تک بچ پائیں گے اور ہم کیسے محفوظ اور مامون رہ سکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ افراد کا مجموعہ ہوتا ہے، ان کے دکھ سکھ سانجھے ہوتے ہیں، جب ظلم کا بازار گرم ہوتا ہے تو سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، جب بے انصافی کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہے تو کوئی بھی بچ نہیں پاتا، جب قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا ہے تو کسی کی جان محفوظ نہیں رہتی اور جب اللہ کا غضب طاری ہوتا ہے تو سب بند رہ جاتے ہیں۔ ہمیں قوموں کے عروج و زوال کا علم ہونا چاہیے، ہمیں تاریخ کو نہیں بھولنا چاہیے، ظلم اور زیادتی بڑی بڑی قوموں کو ملیا میٹ کر گئی۔ قیصر و کسریٰ کیا ہوئے؟ عروج و زوال جیسے قوموں کی زندگی میں آتا ہے۔ ویسے ہی افراد کی زندگی میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آیئے کیوں نہ ہم اپنے رب سے لو لگائیں۔ نفرتوں کو بھول جائیں محبتوں کو گلے لگائیں، ایک ہو جائیں، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح، ایک چٹان کی طرح، کوہ ہمالیہ کی طرح، دیوارِ چین کی طرح، مدینہ کی مواخات کی طرح، سب بھائی بھائی بن جائیں۔ معاف کر دیں تا کہ اللہ کی رحمتیں ہم پر نازل ہوں اس کی برکتیں ہم پر نازل ہوں، پھر ہمیں اپنے ملی ترانے کے مفہوم کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی صورت نظر آ سکے اور حفیظ جالندھری کی روح کی طرح ہمارے آباؤ اجداد کی روحیں بھی مطمئن ہو سکیں اور ہم خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام سکیں۔

☆☆☆

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا

غالب جیسا بڑا شاعر جب یہ کہتا ہے کہ

"شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا"

تو جانے کیا کیا حقائق دل و دماغ پر منکشف ہوتے ہیں، جسم میں قوت ہی قوت رقصاں نظر آنے لگتی ہے، روح محوِ پرواز ہو جاتی ہے، آنکھ میں بلا کی بینائی، ہاتھوں میں بلا کی پھرتی اور پاؤں میں نہ ختم ہونے والی جنبش پیدا ہو جاتی ہے اور انسان مشکلات کو پرِکاہ سمجھنے لگتا ہے اسے پہاڑ رائی نظر آنے لگتے ہیں، سمندر قطرے میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دشتِ امکاں نقشِ پا نظر آنے لگتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ شوق، عشق، ولولہ اور آرزو میں کتنی قوت ہے، انسان بے بال و پر اُڑنے لگتا ہے، وہ سمندروں کے سینے چیرنے لگتا ہے اور لمحوں میں لق و دق صحرا عبور کرنے لگتا ہے، یہ کسی دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ لازوال حقیقت ہے دراصل ذوق ہی انسان کو قوت اور طاقت عطا کرتا ہے، اقبال نے کہا تھا

بلبل از ذوقِ نوا منقار یافت
کبک پا از شوخیِ رفتار یافت

گویا انسان کی آنکھ میں بینائی نہیں ہوتی بلکہ دیکھنے کا ذوق اسے بینائی عطا کرتا ہے اور اگر دیکھنے کا ذوق نہ ہو تو کتنے بینا کورِ چشم نظر آتے ہیں اور اگر ذوقِ تماشا موجود ہو تو وجود کی نس نس آنکھ بن جاتی ہے، ہیلن کیلر جو نہ دیکھ سکتی تھی نہ سن سکتی تھی نے ثابت کر دیا کہ سماعت اور بینائی کا فقدان بے معنی ہے اور محیر العقول کارنامہ سر انجام دے کر ثابت کر دیا کہ شوق میں کتنی قوت ہے، کتنی طاقت ہے، غالب نے اسے ذوقِ فضول اور جراتِ رندانہ کہا تھا یہ ذوقِ فضول اور جراتِ رندانہ بلا کی چیز ہے جو کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا کر دیتی ہے اور کھٹکِ فرومایہ کو

شاہیں سے لڑا دیتی ہے، پتھروں کو زندگی عطا کر دیتی ہے اور انسانوں کو مسجودِ ملائک بنا دیتی ہے، شوق ایک ایسی قوت ہے، ایک ایسا جذبہ ہے جو بے سروسامانی کو خاطر میں نہیں لاتا ۔۳۱۳ بے سروسامان ایک ہزار کیل وکانٹے سے لیس لشکر سے نبرد آزما ہونے لگتے ہیں، کولمبس ایک نئی دنیا دریافت کر لیتا ہے، سکندرِ اعظم دنیا کو زیرِ نگیں کرنے کا حوصلہ دل میں جاگزیں کر لیتا ہے، عرب کے بدو کم وبیش تین براعظموں کو زیرِ نگیں کر لیتے ہیں، یہ وہ جذبہ ہے، یہ وہ احساس ہے جو انسانوں کو لازوال قوت عطا کرتا ہے، اس جذبے کے تحت کہیں غالب واقبال، کہیں حافظ وسعدی، کہیں شیکسپیئر اور ملٹن، کہیں ہومر اور سوفوکلیز، کہیں دانتے اور ٹالسٹائی جنم لیتے ہیں تو کہیں بڑے بڑے سائنس دان، بڑے محقق، بڑے بڑے عالم دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیتے ہیں اور ایسے اللہ والوں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

یہ کمال کے لوگ ہوتے ہیں، ان کے روئیں روئیں میں بجلی بھر جاتی ہے، یہ ناممکنات کو ممکنات میں تبدیل کر دیتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اور ایسے بندوں کو خدا خود پوچھنے لگتا ہے "اے بندے بتا تیری کیا رضا ہے، تو کیا چاہتا ہے؟ جو تو کہے گا، ملے گا، میں تیرا ہوں اور تو میرا ہے" اور یہی لوگ خلافتِ ارضی کی خلعت پہنتے

ہیں، یہی لوگ قبائے فضیلت زیب تن کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شوق سچا ہو اور ارادہ نیک ہو، منزل کا تعین ہو جائے پھر دیکھئے کیا کرشمے کیا اور معجزے سرزد ہوتے ہیں۔

عشق میں اتنی طاقت چاہیے
حسن خود آغوش پھیلانے لگے

یہی شوق کبھی انا الحق کا نعرہ بلند کرتا ہے اور کبھی کہہ اٹھتا ہے "رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی" جب ہیر رانجھا بن جاتی ہے اور بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے تو پھر ساری برکتیں، ساری نعمتیں، ساری خوشیاں ہمارے سامنے ڈھیر ہو جاتی ہیں اور انسان کو خلا قانہ قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

شاخِ نہالِ سدرہ ئی خوار و خس چمن مشو   منکر او گر شدی منکر خویشتن مشو

اور ایسے انسان دنیا کو نئے زمین وآسماں عطا کرتے ہیں، نئے گر دریافت کرتے ہیں، بس بات شوق کی ہے۔ بات کہیں سے کہیں نکل گئی ہم اپنے اردگرد روز دیکھتے ہیں کہ بے سروسامان بچے یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کر لیتے ہیں، مفلوک الحال نونہال کبھی کمشنر بنتے ہیں تو کبھی ڈی سی، کبھی جنرل تو کبھی حکمراں، بابر کیا تھا ایک نوجوان بچہ، اسی "شوق" نے اسے ہندوستان کا شہنشاہ بنا دیا اور پھر ہم نے دیکھا جب یہ شوق ماند پڑ گیا تو "دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں"

مغلیہ سلطنت ختم ہو کر رہ گئی، جب تک جسم میں حرکت موجود رہتی ہے محبت کی آگ جلتی رہتی ہے اس وقت تک منزل خود راہی کے قدم چومنے لگتی ہے

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

آج بھی وہی خدا ہے اور ہم سب اسی کی مخلوق ہیں، اس نے ہمیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے ایسی آنکھ عطا کی ہے جو تصور کے اس پار دیکھ سکتی ہے۔ ایسا دل عطا کیا ہے جو ہزاروں

اورلاکھوں دلوں کوگرما سکتا ہے،ایسے پاؤں دیئے ہیں جن کے سامنے مسافت گھٹنے ٹیک دیتی ہے ۔ضرورت عزم کی ہے،حوصلے کی ہے،ارادے کی ہے،درست نصب العین کی ہے،تاریخ کا سینہ ایسی شخصیات سے روشن ہے جنہوں نے ناممکن کوممکن کردکھایااورجن سے ہم لوگ واقف ہیں،خود ہمارے نبیؐ نے وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ عقل آج بھی حیران وششدر ہے،صرف اس لئے کہ انہیں اپنے خداپر یقین تھااوران کے ارادے میں قوت اور حوصلہ تھا

کچھ لوگ تھے ساحل پہ کھڑے کانپ رہے تھے
طوفان تھا، میں تھا، مرا مٹی کا گھڑا تھا

لیکن کم ہمت لوگ اپنی کم ہمتی کی جانے کیا کیا تاویلات پیش کرتے ہیں،وہ تو نبی اکرمؐ تھے ہم کیا کرسکتے ہیں اوروہ یہ بھول جاتے ہیں کہ نبی اکرمؐ تو ہمارے لئے نمونہ تھےاوراگراس ماڈل کوناممکنات میں شامل کرلیں تو یہ بہت بڑا کفر ہوگا بڑی زیادتی ہوگی۔نبی کی پوری زندگی یہ ثابت کرتی ہے کہ

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

مشکلیں آتی ہیں اورٹل بھی جاتی ہیں۔

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نہ خواہد ماند
چنیں نہ ماند چناں نیز ہم نہ خواہد ماند

میں بڑی معذرت سے اپنی زندگی کا حوالہ دینا چاہتا ہوں،جب بینائی چھن گئی تو یار لوگوں کا خیال تھا کہ میں کچھ نہیں کرپاؤں گا وہ والدِ محترم پرطنز کرنے لگےاور کہنے لگے کہ تمہیں کسی جرم کی سزا ملی ہے،یہ کسی پاپ کا نتیجہ ہے لیکن جانے کہاں سے،جانے کس کے فیض،کس کے کرم سے میرے والدِ محترم مایوس نہ ہوئے اور جانے کہاں سے مجھ میں بھی ایک ایسا شوق درآیا ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی جو آج تک ٹھنڈی نہیں ہوسکی ہے۔اوراللہ کے فضل وکرم سے وہ سب کچھ ہوا

جو بظاہر مشکل بلکہ ناممکن نظرآتا تھااس لئے مندرجہ بالا سطور میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہےوہ میری اپنی زندگی کا نچوڑ ہے،میں ایسامحسوس بھی کرتا ہوں اور یقین بھی کرتا ہوں اورایسااللہ کے فضل سے ہوا بھی ہے کہ مشکلیں آئیں اور بچھڑ گئیں،تیرہ راتیں،روشن صبحوں میں تبدیل ہوگئیں خزاں کے بعد بہاریں آئیں،جانے کتنی بہاریں،کچھ کی یادیں اب بھی زندگی میں گل وسوسن اُگا دیتی ہیں اور مزید حوصلہ عطا کرتی ہے،اس لئے میں غالب کے اس مصرعے کووظیفہ سمجھتا ہوں

''شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا''

☆☆☆

تبلیغِ حق

میں فلسفیانہ موشگافیوں میں نہیں پڑتا اور یہ امر زیرِ بحث لانا نہیں چاہتا کہ حق کوئی ٹھوس حقیقت ہے یا مجرد یا یہ کہ حق ایک اضافی اصطلاح ہے، ہر قوم اور نسل حق کی اپنے انداز سے تاویلات کرتی ہیں یا یہ کہ رسل نے کہا تھا۔

"Sin is Geographyical"

اس نے کہا تھا کہ میں انگلستان میں ہوں تو میرا تعلق عیسایت سے ہے اور میں جاپان میں پیدا ہوتا تو میں کنفیوشسٹ ہوتا اور ہم بھی کبھی کبھی یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم اس لئے مسلمان ہو گئے کہ ہم نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لے لیا یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے عظام کا خیال ہے کہ ایک بار شعوری طور پر مسلمان ہونا بھی ضروری ہے یعنی آپ اپنے پورے شعور اور آگہی کے ساتھ یہ تسلیم کریں کہ آپ کا خالق اللہ ہے اور نبی کا پیام آفاقی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے اور قرآن مجید میں بارہا حکم دیا گیا ہے کہ جو اچھی بات ہمیں معلوم ہو ہمیں دوسروں تک پہنچانی چاہیے، یہ بھی مانا جاتا ہے کہ حکمت اور سچائی مسلمان کی گم شدہ پونجی ہے، دراصل حکمت بھی حق کی تلاش ہی تصور کی جاتی ہے۔ ہمارے حکماء اور فلسفی یہی کچھ کرتے رہے ہیں، وہ حق کی تلاش میں رہے ہیں، سچ کے متلاشی رہے ہیں اور پھر انہیں حق وصداقت کے وہ خزانے میسر آئے کہ جواب تک بٹ رہے ہیں، تقسیم ہو رہے ہیں، لوگ ان سے فیض یاب اور مالا مال ہو رہے ہیں یوں یہ حقائق کا اعتراف بھی ہے۔ یوں سائنس بھی ایک سچائی کا نام ہے کہتے ہیں کہ سائنس نے کوئی نئی بات نہیں کی بلکہ ان باتوں کو دریافت کیا، ان حقائق کو واشگاف کیا جو انسان سے مخفی تھے، جنہیں وہ نہیں جانتا تھا اس لئے کوئی بھی سائنسی انکشاف محض انکشاف ہے کوئی نئی بات نہیں لیکن سچ اور حق کے جس پہلو پر ہم یہاں گفتگو کرنا چاہتے ہیں وہ معاشرتی اور اخلاقی سچائی ہے، آپ چاہیں تو اسے

مذہبی صداقت کہہ لیں یا مذہبی اصول کہہ لیں۔ ویسے بھی ہر انسان بے تاب ہوتا ہے کہ جو اسے معلوم ہے وہ دوسروں کو بتائے اور بتاتا چلا جائے۔ اس لئے کم و بیش ہر شخص مبلّغ ہے دوسروں تک کچھ پہنچانا چاہتا ہے، کچھ سچائیاں عام کرنا چاہتا ہے، ان سچائیوں کا تعلق اس کے اپنے اوہام سے ہو یا چاہے حقائق سے۔ لیکن ہماری رائے میں اس ساری کوشش کا ایک قابلِ غور پہلو یہ بھی ہے کہ جو حقائق اور سچائیاں ہم دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں کیا ہم خود اس کے قائل ہیں، ہم اسے دل سے قبول کرتے ہیں، صرف یہ کہہ دینے سے کہ ہم نے اس کی بات کو دل سے قبول کر لیا، بات نہیں بنتی، بات تب بنے گی جب دل کی بات زبان کے ساتھ ساتھ عمل کا جزو لاینفک بھی بنے۔

ہماری رائے میں تبلیغ کا بہترین اسلوب اس سچ پر عمل کر کے دکھانا ہے جس کی تبلیغ کی جارہی ہے ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پیغمبرؐ نے اپنا نمونہ پیش کیا اسلام کی آمد سے قبل بھی ان کی شخصیت اتنی بلند اور تابناک تھی کہ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا اور ہر ایک ان کی بات ماننے کے لئے تیار تھا حالانکہ ابھی انہیں منصبِ نبوت عطا نہیں ہوا تھا، ضروری تھا کہ منصبِ نبوت ایسی شخصیت کو ملے جس کی ذات، سچائی، ایمانداری، ہمدردی اور بنیادی انسانی اقدار کا مرقع ہو، یہی وجہ ہے کہ تیئیس سال میں وہ کام ہو گیا جو شاید محض وعظ و تلقین سے تیئیس سو سال میں بھی ممکن نہیں تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے عمل سے متاثر ہوتا ہے جب وہ کسی کو کچھ کرتے دیکھتا ہے تو اسے خود اس کی سچائی کا یقین آجاتا ہے۔ آپ سچ کی تلقین کرتے جائیں مگر جب وقت آئے تو سچ سے گریز کرتے جائیں تو آپ کے سچ کا بھانڈہ پھوٹ جائے گا، آپ کی تبلیغ اور تلقین بے اثر ہوگی، بے معنی ہوگی، ہماری قوم کا ایک المیہ یہ رہا ہے کہ ہم نے وعظ و تلقین پر ہی سب وقت صرف کیا ہے جسے دیکھئے واعظ ہے ناصح ہے، مقرر ہے، مبلّغ ہے، مگر کتنے ہیں جو صاحبِ کردار ہیں، جو قول کے دھنی ہیں، جو عمل کے کھرے ہیں، جن کی زبان ان کے عمل سے مطابقت رکھتی ہے۔ سچ کی تلقین کرنا اچھی بات ہے لیکن یہ قدرے آسان عمل ہے مگر سچ پر عمل کرنا کہیں زیادہ دشوار کام ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کہیں کہیں سچ بولنا بھی جان لیوا ثابت ہوتا ہے اور جہاں منافقت اور

دروغ کوئی عام ہو وہاں سچا انسان جن مشکلات سے دوچار ہوتا ہے ان کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں۔خود ہمارے اپنے معاشرے میں سچ بات کہنا بھی کوئی اتنا آسان کام نہیں،ہم کہتے ہیں اور سنتے ہیں کہ Boss is always right، کتنے ہیں جو اپنے افسر اپنے مالک، اپنے سے زیادہ طاقتور کے سامنے کلمۂ حق بلند کر سکتے ہیں تو بہت سے کہتے ہیں کہ مجھے سچ بولنے کی عادت ہے اس لئے مجھے سچ بولنے دیجئے، میں سچ بول کر رہوں گا،لیکن دراصل سچے وہ نہیں ہوتے بلکہ سچ ان کی کری ہوتی ہے،ان کی طاقت ہوتی ہے،مزا تو تب ہے کہ سچ بولنے والا سچ سن بھی سکے اور اس وقت بھی سچ بولے جب اس کے پاس عہدہ اور منصب ہو۔ہماری رائے میں ہم صحیح راہ پر پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ ہم محض وعظ و تلقین تک محدود رہتے ہیں، ہمارے ہاں بہت بڑا طبقہ یہ کام سرانجام دے رہا ہے اور سالہا سال سے دے رہا ہے لیکن معاشرتی حوالے سے ان کی کوششیں کم و بیش اکارت گئی ہیں، تلقین و تبلیغ کے بہت بڑے اہتمام ہوتے ہیں،لوگ ارکانِ اسلام کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ سچائی،انصاف،مساوات ہمدردی جیسے اوصاف بھی ارکانِ اسلام ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سماجی پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھیں وگرنہ ہمارے مسائل بڑھتے چلے جائیں گے اور جس المیے سے اب ہم دوچار ہیں اس سے کبھی نجات ممکن نہ ہو گی،ہم یونہی تڑپتے رہیں گے،ہماری راتیں بے خواب گزریں گی اور ہمارے دن بے قرار۔نہ ہماری جان کی حفاظت ہوگی نہ عزت کی،نہ مال و منال کی،نہ ہمارا حال محفوظ ہوگا،نہ مستقبل۔کاش کہ ہم جو کہتے ہیں اس پر بھی عمل کر سکیں۔جو ہم دوسروں سے چاہتے ہیں وہ ہم خود بھی کر سکیں۔یہ کام بہت مشکل سہی لیکن ان کے بغیر ہماری تمام نصیحتیں اور وعظ و تلقین اکارت جائیں گی اور ہم روز بروز ادبار اور زوال کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے شاید صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے اور اقبال کے شعر میں تھوڑا سا تصرف کر کے ہم کہہ سکتے ہیں۔

"ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

☆☆☆

کھیلیں اور حبِ وطن

طبعِ انسانی بڑی عجیب و غریب واقع ہوئی ہے کبھی انسان کھیلتے کھیلتے لڑنے لگتا ہے اور کبھی لڑتے لڑتے کھیل کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اگر دلچسپ صورتحال کا مشاہدہ کرنا ہو تو روسی ڈرامہ نگار چیخوف کا ڈرامہ "ریچھ" دیکھ لیجئے کہ کس طرح سمر نووا اور پوپووا لحوں میں دھینگا مشتی سے چوما چاٹی پر اتر آتے ہیں ایسی صورتحال کبھی کبھی بڑی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی ایمان افروز ۔ہمارے ہم وطنوں کا کھیلوں کے حوالے سے کچھ ایسا ہی حال ہے کہ اگر کرکٹ میچ، ہاکی میچ یا کوئی میچ بالخصوص بھارت سے ہو رہا ہو تو ہماری حبِ وطن عروج پر پہنچ جاتی ہے ایسا لگتا ہے کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی محبِ وطن قوم ہیں، ہمیں اپنے وطن سے اتنا پیار ہے کہ ہم سب کچھ اس پہ فدا کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ جب پاکستانی ٹیم ایک رن بناتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اہلِ وطن کا ایک ایک پاؤنڈ خون بڑھ گیا ہو۔جب کوئی چوکا لگتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے دشمن کے خلاف کوئی جنگ جیت لی ہو، جب چھکا لگتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کو ویٹو پاور مل گئی ہے یا پھر مقبوضہ کشمیر پر پاکستانی جھنڈا لہرانے لگا ہے یا ہم نے صیہونی قوتوں سے فلسطین آزاد کروا لیا ہے یا پھر پاکستان میں سونے اور ہیروں کے ذخیرے دریافت ہو گئے ہیں اور جب بھارتی ٹیم کھیلنے لگتی ہے تو دعا کے لئے ہاتھ بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور جب کوئی بھارتی کھلاڑی آؤٹ ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ پاکستان کی جھولی میں بھارت آ گرا ہے اور اگر پاکستانی ٹیم جیت جائے تو کیا کہنے سٹہ بازوں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں اور خوشی کے مارے ہوائی فائرنگ شروع ہو جاتی ہے چاہے اس سے کسی کی جان چلی جائے مٹھائیاں تقسیم ہونے لگتی ہیں اور نعرۂ تکبیر کے نعرے اس طرح بلند ہوتے ہیں جیسے کہ شاید جنگِ بدر میں ہوئے ہوں حالیہ ایشیا کپ میں بھارت کے خلاف کامیابی پر تو اہلِ ایمان نے عمرہ تک کیلئے ٹکٹ دینے کا اہتمام کرنا شروع کر دیا

اورگلیوں اور بازاروں میں کچھ اس طرح جلوس نکالے جیسے پاکستان کے سارے مسائل حل ہو گئے ہوں، تھر پارکر کے پیاسے اور بھوکے دولت میں کھیلنے لگے ہوں، دہشت گردوں کے تابوت میں آخری کیل گاڑ دی گئی ہو جیسے ہر چیز ارزاں ملنے لگی ہو، جیسے سارے پاکستانی سچ مچ بھائی بھائی ہو گئے ہوں فرقہ پرستی اور صوبائیت ختم ہو گئی ہو۔ جب پاکستان کو کسی کھیل کے میدان میں کامیابی ملتی ہے تو خوشی تو ہمیں بھی ہوتی ہے، ہم بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، چلیے حبس زدہ ماحول میں کہیں سے تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا شاخِ زندگی پر کوئی کونپل تو پھوٹی لیکن ہمیں اس وقت بھی خوشی ہوتی ہے جب ہم ارفع کریم کو کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا ہوا دیکھتے ہیں یا ہم اپنے علی نواز کو تعلیمی میدان میں سبقت لیتا ہوا دیکھتے ہیں۔ جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کرپشن کے حوالے سے ہمارا وطن عزیز کچھ بہتر صورتحال سے ہمکنار ہوا ہے لیکن اس کے برعکس ہم خون کے آنسو روتے ہیں جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ممالک میں تعلیمی اعتبار سے ہمارا کیا درجہ ہے صحت کے اعتبار سے ہم کہاں کھڑے ہیں، خطِ غربت سے نیچے کتنے اہلِ وطن زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں، کتنے ہیں جن کے تن پر کپڑا نہیں، کتنے ہیں جو ہسپتالوں میں دوا کے نہ ملنے سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتے ہیں۔ کتنی خواتین ہیں جو ظلم وستم کا شکار ہیں کتنے ہیں جو بے روزگاری کی وجہ سے نفسیاتی مریض ہو جاتے ہیں یا خودکشی پر مجبور ہو جاتے ہیں کتنے ہیں جو بھتہ خوری کا شکار ہیں، کتنے ہنستے کھیلتے شہر قبرستان کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ روشنیوں کا شہر اندھیروں میں ڈوب گیا ہے اور ہمارے چھوٹے بڑے شہر خوف وہراس کا شکار ہیں کیا اہلِ وطن اس صورتحال سے واقف نہیں کیا عزیزانِ وطن محض کھیل کھیل ہی میں زندگی کی بازی جیتنا یا ہارنا چاہتے ہیں وہ اس دن کا انتظار کیوں نہیں کرتے جب اقبال اور قائد کے خواب شرمندہ تعبیر ہوں گے، وہ ایسے معاشرے کے لئے دعائیں کیوں نہیں کرتے جو باہمی رواداری اور باہمی محبت سے زندگی گزارنے کے قائل ہو، کتنے ہیں جو ایسی روشن صبح کے لئے بے تاب ہیں جو ملک کی تمام تاریکیوں کو بقعۂ نور بنا دے لیکن جب عوام الناس چھوٹے بڑے غریب امیر میچ ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو انہیں اپنے سارے فرائض

بھول جاتے ہیں، کاروبار بند ہو جاتے ہیں، دفاتر سائیں سائیں کرنے لگتے ہیں خواتین کھانا پکانا بھول جاتی ہیں کیا یہ سب کچھ ہمارے لئے ایک لمحہ فکریہ نہیں، کیا ہمیں نہیں سوچنا چاہیے کہ وطن کی محبت کے کیا کیا تقاضے ہیں، کیا کیا فرائض ہیں جو ہمیں ادا کرنے ہیں، کیا کیا حقوق ہیں جو ہمیں ملنے چاہئیں۔ جب کوئی میچ ہوتا ہے یقیناً میں اس میں دلچسپی لیتا ہوں مگر مندرجہ بالا افکار بھی مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں اور اہلِ وطن کی سرشاری کبھی کبھی مجھے نشہ آور گولیوں کے مترادف نظر آتی ہے یا مجھے ٹینی سن کے لوٹس ایٹرز یاد آنے لگتے ہیں جو جنگ سے واپسی میں ایک ایسے باغ میں پہنچ گئے تھے جہاں لوٹس پھل کھا کر وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں، اپنی بیویوں کو بھی، اپنے بچوں کو بھی اور محنت اور مشقت کے مرثیے پڑھنے لگتے ہیں۔ ہمارے کھیل لوٹس کے پھل نہیں تو اور کیا ہیں عزیزانِ وطن کو ہمیشہ یہ دھیان رہنا چاہیے کہ ان کی اگلی نسلیں کس صورتحال سے دوچار ہونے والی ہیں، کتنے گھمبیر مسائل ہمیں دامن گیر ہو سکتے ہیں، توانائی کے بحران کی طرح ہم پانی کے بحران سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔ یہ تمام معروضات بڑی دل سوزی سے سپردِ قلم کی جا رہی ہیں، اللہ کرے ہم اس نیند سے بیدار ہو جائیں جس کے باعث ہم حقیقتِ حال سے بالکل بے بہرہ ہو گئے ہیں اور کبھی کبھی کہہ اٹھتے ہیں۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

☆☆☆

بے چارے شوہر

بے چارگی، بے بسی ، بے کسی ، مجبوری و معذوری زندگی کا جزوِ لاینفک رہی ہیں۔حضرت آدمؑ کو حکم تھا کہ وہ درخت کے قریب مت جائیں لیکن وہ اپنی انسانی خاصیتوں کے باعث مجبور تھے کہ وہ حکم عدولی کریں اور نتیجتاً اللہ کی برہمی مول لیں اور پھر اسے منت اور سماجت سے منائیں۔دراصل زندگی کا خمیر ہی اختیار اور بے اختیاری سے عبارت کیا گیا ہے،اسے اشرف المخلوقات بھی بنا دیا گیا ہے اور پھر قدم مقدم پر آزمائشوں سے گزرنا بھی اس کا مقدر ٹھہرا ہے۔خیر یہ تو نری فلسفیانہ موشگافی کہی جا سکتی ہے،ایک بات جو بہت واضح ہے جس کا ثبوت تاریخ نے فراہم کیا ہے اور ہمارے اپنے تجربات نے بھی کہ انسان دوسری ذی حیات مخلوق کی طرح اپنی بقا کے لئے قوت وطاقت کا جویا ہے یعنی یہ کہ یہاں وہی زندہ رہے گا، جو طاقت ور ہو۔ملٹن نے کہا تھا کہ To be weak is miserable اور یہی بات علامہ اقبالؒ نے کچھ یوں شعری پیکر میں ڈھالی تھی۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے　　ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اگر اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے تو نہ تو شوہر بے چارہ ٹھہرتا ہے اور نہ ہی بیوی بلکہ بے چارہ تو وہ ہے جس کے پاس کوئی طاقت وقوت نہیں۔شاید مرد اس لئے بھی معتز ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ صنفِ نازک کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہے،زیادہ جسمانی قوت رکھتا ہے اور زیادہ تجربہ بھی۔عورت چونکہ روایتی طور پر مرد کے مقابلے میں زیادہ پابندیوں سے دوچار ہوتی ہے اس لئے اسے دنیاداری،عیاری اور مکاری سے قدرے کم واسطہ پڑتا ہے اور وہ کم وبیش اس ہنر سے بے بہرہ ہی رہتی ہے اور یہ وہ ہنر ہے جو بسا اوقات ادنیٰ کو اعلیٰ بنا دیتا ہے اور گدا کو بادشاہ، چور کو سپاہی اور کمزور کو طاقتور۔یہ سچ ہے کہ جس زمانے میں ہم سانس لے رہے ہیں وہ گزرے ہوئے ادوار سے بہت

مختلف ہے اب ہر جگہ آزادیٔ نسواں کی بات ہے۔عورت ہی شمعِ محفل ہے اور تمام خوبیوں اور حسن و رعنائی کا مرکز اور اسے یہ احساس بھی ہو گیا ہے کہ اب اسے سارے حساب چکانے ہیں۔جس ظلم و ستم کی چکی میں اسے پیسا گیا ہے اب اسے مرد کو پیسنا ہے، چنانچہ اب وہ بڑی سرعت کے ساتھ زیورِ علم وہنر سے آراستہ ہو رہی ہے اور حکمرانی کے گُر سیکھ رہی ہے۔بہرکیف بہتری کی خواہش پیدا ہونا بہر طور قابلِ تحسین ہے لیکن ہم جس طرح مرد کی ظلم وزیادتی کو رد کرتے رہے ہیں ہم اسی طرح عورت کی دست درازی کو بھی گھناؤنا عمل قرار دیں گے۔دیکھنے میں آیا ہے کہ جو خواتین اونچے عہدوں پر فائز ہیں وہ اپنے شوہروں کو اسی انتقامی کارروائی کا شکار کر رہی ہیں جس کا وہ کبھی خود ہوا کرتی تھیں۔یہ پہلو تو قابلِ غور ہے ہی لیکن اکثر وبیشتر گھریلو بیویاں بھی اپنے شوہر کو بے پناہ اذیت کا شکار رکھتی ہیں۔مجھے یاد ہے کہ ایک مباحثہ منعقد تھا کہ شوہر نے بیوی کی زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے تو ایک صاحب فوراً کھڑے ہوئے اور بولے کہ ”آپ کی ان شوہروں کے بارے میں کیا رائے ہے جو بیوی کے ہاتھوں ظلم وزیادتی کا شکار ہو جاتے ہیں“ کسی نے کہا اس میں قصور مرد کا اپنا ہے تو وہ صاحب بولے ہاں مرد کا اپنا اس لئے ہے کہ عورت اپنے بچوں کو مرد کی صورت پرداخت کر کے ہمنوا بنا لیتی ہے، بیٹا اس کے لاڈ پیار سے اس کا دم بھرنے لگتا ہے اور پھر باپ کے مقابلے میں صف آرا ہو جاتا ہے اور پھر کچھ یوں بھی ہوتا ہے کہ بیوی کے بھائی اور باپ اپنی بیٹی کو کچھ اس انداز سے تحریک دیتے ہیں کہ وہ شوہر کو سرے سے اہمیت ہی نہیں دیتی۔کہتے ہیں کہ عورت ہمیشہ مشکلات کا شکار رہی ہے اور مرد نے اس سے انصاف نہیں کیا لیکن اکثر گھرانوں میں عجیب وغریب صورتحال پیدا ہو جاتی ہے عورتیں گھروں میں رہ کر چڑ چڑی اور تنگ نظر ہو جاتی ہیں۔شوہر دفتر میں Boss کی جھڑکیاں سہتا ہے اور گھر پہنچتے ہی بیوی اس پر برس پڑتی ہے ”کہاں رہے، دیر کیوں کر دی، گھر کی پروا نہیں، جانے تم کہاں کہاں جاتے ہو اور اب جبکہ بیویاں شوہروں کی طرح دفتروں، فیکٹریوں اور تعلیمی اداروں میں فرائض انجام دے رہی ہیں تو ان کی جھڑکیاں کچھ اور انداز اختیار کر گئی ہیں۔جب گھر پہنچتی ہیں تو شوہر پر حکم چلانے لگتی ہیں، دیکھتے نہیں تھک کر آئی ہوں۔۔۔

کھانا خود لے لو۔۔۔میرے لئے بھی چائے بنا دو، سنا نہیں۔۔۔اور پھر بے چارہ شوہر اس کے اشاروں پر رقص کرنے لگتا ہے، بلکہ میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ شوہر تو بیوی کا شوفر ہوتا ہے، سبزی لائے تو وہ، کپڑے دھلوائے تو وہ، کسی دفتر کا کوئی کام ہو تو اس کے ذمے، گھر کے باہر کے سارے کام اسے ہی سرانجام دینا ہیں اور گھر کے اندر بھی اس کو بیوی کا ہاتھ بٹانا ہے اور بیوی جو تنخواہ لاتی ہے وہ خود اس کی مالک ہے جیسے چاہے خرچ کرے، جہاں چاہے خرچ کرے مگر شوہر ہاتھ جوڑ کر اپنے مہینے کی کمائی اس کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ کہہ اٹھتی ہے بس یہی کچھ! یہ صورتحال آفاقی نہ سہی مگر اس کی بے شمار مثالیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں اور موجود رہی ہیں سارے قوانین عورت کے حق میں، ساری ہمدردیاں اس کی جھولی میں، ساری محبتیں اس کی نذر اور سارا غیض و غضب شوہرِ نامدار کے نام، جو کبھی کبھی چیخ اٹھتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے بُرا ہو اس شوہر ہونے کا، اچھا ہوتا کہ میں بیوی ہوتا" پھر کبھی اپنی اداؤں سے اسے گھائل کرتا اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ پلاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے جانے کتنے شوہر چیختے اور چلاتے دیکھے ہیں، خودکشی کرتے دیکھے ہیں، تڑپتے دیکھے ہیں، تنہا زندگی گزارتے دیکھے ہیں، اس لئے چونکہ وہ مرد ہے اس لئے وہی قصوروار ہے یقیناً مردوں نے عورتوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے لیکن ایسا ہر مرد نے نہیں کیا۔ اس لئے ایسے مرد جو بیویوں کے غیض و غضب کا شکار ہیں ان پر ترس آتا ہے، بے چارہ مرد اگر بیوی کے نخرے برداشت کرے تو ماں روٹھ جاتی ہے، بہن ناک بھوں چڑھاتی ہے اور اگر ماں سے محبت کرے، بہن سے پیار کرے۔ تو بیوی پھٹ پڑتی ہے۔ ہر مرد۔۔۔ بے چارہ مرد۔۔۔ جسے نہ خدا ہی ملتا ہے اور نہ وصالِ صنم۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ صرف مردوں ہی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے بلکہ صورتحال کا درست پس منظر میں مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ ایسا ممکن ہے کہ شوہر کی زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہو ایسا ممکن ہے کہ اس کا تمام سکون ختم ہو گیا ہو۔ وہ اگر عورت سے پیار کرے تو "زن مرید" اور اگر اس کے فرائض یاد دلائے تو وہ شقی القلب، ظالم اور ستم گر، جائے تو جائے کہاں۔۔۔ آپ بھی سوچئے۔۔۔۔ میں بھی سوچ رہا ہوں۔

خودی کا سرِ نہاں۔۔لا الٰہ الا اللّٰہ

حضرت علامہ اقبال کے تصورِ خودی کو عام طور پر انتہائی پیچیدہ اور گنجلک انداز میں اس طرح پیش کیا جاتا رہا ہے جیسے یہ کوئی ماورائی یا مابعد الطبیعاتی تصور ہو، جس کی تشریح اور توضیح کے لئے جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں جیسے یہ کسی عام ذہن میں آنے والا تصور نہ ہو۔ نقادانِ ادب کی موشگافیوں نے کچھ ایسے گل کھلائے ہیں کہ تصورِ خودی ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے حالانکہ اقبالؒ کا یہ تصور اتنا سیدھا سادہ ہے کہ ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے یہ تو ٹھیک ہے کہ خودی کی اصطلاح اقبالؒ نے خود تراشی تھی لیکن جو کچھ ان کے نظم و نثر کا مطالعہ کر کے ہم پر واضح ہوتا ہے وہ بہت ہی آسان اور عام انسان کے ذہن میں آنے والا ہے۔ علامہ اقبال کے تصورِ خودی سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی صلاحیتوں کا ادراک کرے اور یہ کہ انسان کے دل و دماغ کی وسعتیں بے کراں ہیں۔ جس قدر زیادہ سعی و کاوش کی جائے اسی قدر یہ صلاحیتیں پھولتی پھلتی ہیں نیز اس کے ڈانڈے مشیتِ ایزدی سے مل جاتے ہیں اور ایک انسان مردِ مومن کی قوت اور صلابت حاصل کر لیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اثباتِ خودی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بے بس و مجبور نہ گرداننا شروع کر دے کیونکہ یہ تو کفرانِ نعمت ہوگا۔ انسان اللہ کی مخلوق ہے، اسے اس نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے اور عزت و عظمت دی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ "وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" کہ ہم نے نوعِ انسانی کو عزت بخشی اور یہ کہ جو کچھ کائنات میں ہے سب کچھ انسان کے سامنے ڈھیر کر دیا گیا ہے سب کچھ اس کے لئے ہے یہ زمین و آسمان یہ پھول اور پھل یہ زندگی کی متنوع اور گوناگوں لذتیں اور آسائشیں انسان ہی کے لئے ہیں لیکن اس انسان کے لئے جو اپنے دل کو بیدار اور ذہن کو تیار رکھتا ہو اور ہمہ وقت اپنی جان پر کھیلنے کے لئے تیار ہو وہ اپنی ذات کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر گوہرِ مراد تلاش کرے یعنی یہ کہ اسے معلوم ہو کہ اللہ نے اسے کتنی صلاحیتوں سے نوازا ہے اس کی پانچ

حیات ہی نہیں بلکہ بے حدوحساب ذہنی اور جسمانی حیات ہیں جن کے ذریعے وہ تسخیرِ کائنات کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے، سمندروں کا سینہ چیر سکتا ہے آسمان کو چھوتے پہاڑوں کو سر کر سکتا ہے لق ودق صحراؤں میں گلستان اگا سکتا ہے، ہواؤں کو اپنے زیرِ نگیں کر سکتا ہے اور وہ ایسے محیرالعقول کارنامے سرانجام دے سکتا ہے جو یونانی اور ہندوستانی دیوتاؤں کے لئے بھی ممکن نہ تھے۔ ایک یونانی دیوتا آرگس کی تو صرف سو آنکھیں تھیں مگر مردِ مومن کے وجود کی نس نس سے آنکھ جھانکتی ہے۔ بس اس احساس کا ادراک ہی تصورِ خودی کی تشریح و توضیح ہے بظاہر انسان چند مادی عناصر کا مجموعہ ہے لیکن اس کے سامنے فرشتوں نے سجدہ ریز ہو کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ انسان کتنا عظیم اور محترم ہے کہ

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بنا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

وہ محنت کیا ہے وہ محنت اسکے سوا کچھ نہیں کہ انسان یہ یقین کر لے کہ وہ ایک مشتِ خاک نہیں بلکہ وسعتِ آفاق رکھتا ہے اس کی شخصیت بے ہمتہ اور بے مثال ہے کیونکہ وہ اللہ کی تخلیق ہے اور اس کی بہترین تخلیق ہے اور وہ خلیفۃ اللہ فی الارض تمام مخلوقات پر حکمران ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ   غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

لیکن اقبال کے نزدیک خودی کی تعمیر اور خودی کا ادراک اسی وقت ممکن ہے جب انسان زمینی دیوتاؤں کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کر دے جب اس کی تمام قوتیں اور صلاحتیں احکام الٰہی کے مطابق بروئے کار آنے لگیں تو صرف اس وقت وہ پوری کائنات کا بلا شرکتِ غیرے مالک بن سکتا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

لیکن شومئ قسمت سے کچھ ایسے نظریات، کچھ ایسا افکار اور کچھ ایسے خود ساختہ ادیان

منظرِ عام پر آئے جنہوں نے انسان کو انسان کا غلام بنا دیا۔ انسان ہی کیا جانے کتنے خداؤں، کتنے دیوتاؤں، کتنے حاکموں کتنے شہنشاہوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے لگا۔ کبھی وہ ہواؤں کو پوجنے لگا کبھی سمندروں سورج اور چاند کو۔ سورج چاند ہی کیا وہ اپنی اغراض کے لئے ہر ایک کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنے لگا، کبھی دولت کے بت کے سامنے، کبھی طاقت کے بت کے سامنے ناصیہ فرسائی کرنے لگا۔ وہ بے بس اور مجبور ہو کر رہ گیا اور کاسہ لیسی اس کی فطرت ثانیہ بن گئی تقدیر کو اس نے اپنا دیوتا مان لیا اور یہ تصور کرنے لگا کہ اس کے تو بس میں کچھ بھی نہیں وہ تو مجبور محض ہے بے بس ہے، بس کس ہے، بے چارہ ہے، حالات کا مارا ہے اور اس بے چارگی کے عالم میں اس نے اپنی شخصیت کو ہی مسخ کر لیا اپنے جیسے انسانوں کو مشکل کشا تصور کر لیا اور انہیں اپنی تمام حاجات اور خواہشات کا منبع تصور کر لیا پھر کچھ یوں ہوا بلکہ بہت ہی برا ہوا کہ انسان نے دولت، شہرت اور طاقت کی پوجا پاٹ شروع کر دی دولت کے حصول کے لئے وہ اپنے خالق تک کو بھول گیا شہرت کی خاطر اس نے اپنی اخلاقیات کے سارے نظام کو تہہ وبالا کر دیا اور طاقت کے نشے میں کبھی وہ فرعون بنا اور کبھی شدّاد اور کبھی نمرود۔ ہم اقبال کے تصورِ خودی کو بھول کر آسمان کی بلندیوں سے زمین پر آگرے اور ہمیں یوں لگنے لگا کہ دنیا میں ہم سب سے زیادہ دکھی پریشان حال اور ضیعف وکمزور ہیں جبکہ ہم ہر نماز میں بار بار کہتے ہیں "اِیاَّ کَ نَعْبُدُ وَ اِیاَّ کَ نَسْتَعِیْنَ "لیکن حقیقت میں ہم کسی اور کی پوجا کرتے ہیں اور کسی اور سے مدد چاہتے ہیں اگر ہم اقبال کے تصورِ خودی کو صحیح سیاق وسباق میں سمجھنے لگیں تو ہم میں پھر اعتماد پیدا ہو جائے گا، قوت پیدا ہو جائے گی اور ہم تسخیرِ کائنات کا فریضہ سرانجام دینے لگیں گے، ناقابلِ تسخیر بن جائیں گے، سیسہ پلائی دیوار بن جائیں گے۔ حوصلے کا پہاڑ بن جائیں گے اور یوں اچھے دن لوٹ آئیں گے....... اچھے دن لوٹ ہی آیا کرتے ہیں بشرطیکہ انسان اپنی صلاحیتوں کا صحیح ادراک کرنے لگے اور انہیں بروئے کار لانے لگے ہیں یہی حقیقت اقبال نے اپنے اس لازوال مصرعے میں کہی تھی۔

"خودی کا سِرِ نہاں ۔۔ لاالٰہ الااللّٰہ"

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

حسنِ دل آراء، روح افزا اور نظر نواز کو لفظوں اور جملوں کی گرفت میں لینا اگر ناممکن نہیں تو کارِ محال ضرور ہے۔ ہاں ہاں حسن تو ایک خوشبو ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن چھوا نہیں جا سکتا، حسن ایسا احساس ہے جسے لفظ بیان کرنے سے قاصر ہیں اور عقل و خرد اس کی تفہیم سے نابلد اور ناآشنا۔ سچ تو یہ ہے کہ حسن کا تصنع اور بناوٹ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ قبائے گل میں کوئی گل بوٹا نہیں ہوتا۔ چاند اپنے حسن کے لئے کوئی پیرہن زیب تن نہیں کرتا۔ دریاؤں کی روانی کا حسن کسی مصنوعی پن کا رہینِ منت نہیں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی چادر کسی دستِ انسانی کی صناعی کی محتاج نہیں یہ تو وہ قدرتی حسن ہوتا ہے جو علامہ اقبال کو دخترِ دہقان کے گیت میں محسوس ہوا تھا، جس کو ورڈز ورتھ نے ایک سیدھی سادھی دیہاتی دوشیزہ کو گھاس کاٹتے ہوئے اور گنگناتے ہوئے محسوس کیا تھا، وہ اس نغمے کے معنی تو نہیں سمجھتا تھا مگر نغمگی نے اس قدر مسحور کر دیا تھا کہ وہ وہیں تھم کر رہ گیا تھا اور جب آگے بڑھا بھی تھا تو اس کے کانوں میں وہی نغمہ رس گھول رہا تھا، حسنِ خالص اقبال کو مسجد قرطبہ میں نظر آیا تھا جس نے ایک معرکۃ الآرا نظم کو جنم دیا تھا اور یہ وہ حسن ہے جو جگہ جگہ بکھرا پڑا ہے مگر اسے دیدۂ بینا ہی دیکھ سکتی ہے۔

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

یہ وہ حسن ہے جسے بسا اوقات دیکھنے والے کی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے جو ایک عامیانہ آنکھ کی گرفت میں نہیں آ سکتا، یہ ابدی اور ازلی حسن تخلیقِ انسان میں بھی مضمر ہے جس کا اظہار خالقِ کائنات نے بارہا کیا ہے، جس کو دیکھ کر اور محسوس کر کے گیت جنم لیتے ہیں، غزلیں ہوتی ہیں، تصویریں بنتی ہیں اور فنونِ لطیفہ کی تمام اشکال نمو پذیر ہوتی ہیں۔ کیٹس نے کہا تھا کہ خوبصورت چیز

دائمی مسرت کی حامل ہوتی ہے اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ حسن ہی صداقت ہے اور صداقت ہی حسن۔ لیکن اس وقت میرے سامنے وہ حسن ہے جو اتفاقی اور حادثاتی ہوتا ہے اور شاعر کے ذہن میں ایسا ہی حسن تھا جب اس سے یہ شعر ہوا تھا۔

قدم گن گن کے رکھتے ہیں، کمر لچکا ہی جاتی ہے
خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

حسنِ حقیقی اور حسنِ خالص میں یہ صورتحال پیدا نہیں ہوتی کیونکہ ایسا حسن تو حسن گر ہوتا ہے، حسن پھیلاتا ہے، حسن افزائی کرتا ہے۔ یہاں زیرِ نظر وہ حسن ہے جو کسی نہ کسی انداز سے مستعار ملا ہے، چھین لیا گیا ہے، نوچ لیا گیا ہے اور اس حسن کا تعلق عام معمولاتِ زندگی سے ہے۔ اگر کسی عامی کو خصوصیت حاصل ہو جائے یا اگر کوئی ذرہ مسند نشیں ہو جائے تو وہ آفتاب تو نہیں بنتا مگر آفتاب بننے کی مصنوعی کوششیں ضرور کرنے لگتا ہے۔ ہم ان احباب کو جانتے ہیں جنہیں کسی مخصوص صورتحال نے مسند عظمت پر بٹھا دیا اور وہ اپنی ذات کو بھول گئے، ایاز نہ رہ سکے۔ آپ ان سے بات کیجئے ان کا چہرہ کہیں اور ہو گا اور وہ بات آپ سے کر رہے ہوں گے، آپ انہیں سلام کیجئے تو جواب تو درکنار ان کو یہ تک محسوس نہیں ہو گا کہ کسی نے ان کی سلامتی چاہی ہے۔ بشیر بدر نے کیا خوب کہا تھا

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے یہاں فاصلے سے ملا کرو

آپ احتراماً یا محبت سے ہاتھ ملانا چاہتے ہیں تو موصوف دو انگلیاں آگے بڑھا دیتے ہیں، آپ گلے ملنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے لباس کی کریز کی پڑ جاتی ہے یا وہ سہم سے جاتے ہیں کہ کہیں آپ خودکش حملہ آور ہی نہ ہوں۔ میں ایک بظاہر پڑھے لکھے انسان کو جانتا ہوں جو بات تو ہم سے کیا کرتے تھے مگر نظریں اخبار پر گڑی ہوتی تھیں، میں تو انہیں بھی جانتا ہوں جو میرے ساتھ نشست پر جلوہ افروز ہوتے ہیں مگر انا کے ہاتھوں مجھ سے گویا نہیں ہوتے اور جب میں انہیں سلام

کرتا ہوں تو قدرے چونک کر خلوص کا اظہار کرتے ہیں۔ چلئے مجھے تو چھوڑیے میں تو انہیں دیکھ نہیں سکتا جو انہیں دیکھ بھی سکتے ہیں تو وہ ان سے بھی اس طرح ملتے ہیں کہ شاید ان سے کبھی واقف ہی نہ تھے۔ یہ شانِ بے نیازی دیدنی بھی ہے اور شنیدنی بھی، اس کا تجربہ آپ کو اکثر ہوتا رہتا ہوگا اور مجھے تو اکثر و بیشتر ہوتا ہے یہ مصنوعی حسن صرف مصنوعی حسن ہی کو پہچان سکتا ہے، حسنِ حقیقی کی کوئی پہچان نہیں ہوتی اور نزاکت بھی ایسے ہی حسن میں آتی ہے جو اتفاقاً حسین بن گیا ہو، کسی عہدے پر فائز ہو گیا ہو، کسی مسند پر جلوہ افروز ہو گیا ہو، کسی جاگیردار کا مصاحب ہو گیا ہو یا جعلی طریقوں سے صاحبِ حیثیت بن گیا ہو۔ ایم پی اے، ایم این اے یا منسٹر بن گیا ہو، لیکن جب زندگی کا جادوگر نمودار ہوتا ہے اور ان سے ان کی قبائیں نوچ لیتا ہے، تو ان کی اصلیت ظاہر ہونے لگتی ہے، غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے، گردن کا سریا ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور پھر

ع پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

حضور آپ کے پاؤں تو آسمان میں ہوا کرتے تھے آپ تو راجہ اندر تھے، آپ کو تو پریاں سلام کرتی تھیں پھر یہ کیا ہوا کہ آپ ایک سلام کو بھی ترسنے لگے۔ اب آپ چھپتے چھپاتے پھرتے ہیں اور بچتے بچاتے نکل جاتے ہیں وجہ یہ ہوئی کہ جب حسن آپ کے ہاتھ لگ گیا تو آپ نے اسے اپنی جاگیر سمجھ لیا، یہ سمجھ لیا کہ یہ وقتی حسن ہی دائمی ہے، دائمی حسن ہر حال میں حسین رہتا ہے، اسے زوال نہیں، یہ کبھی منہ کے بل نہیں گرتا، یہ حسن علم و آگہی کا حسن ہوتا ہے، یہ حسن ایثار و قربانی کا حسن ہوتا ہے، یہ حسن صداقت و دیانت کا حسن ہوتا ہے اور دراصل یہی حسن ہوتا ہے۔

☆☆☆

نابیناؤں پر تشدد

۳ دسمبر 2014 یہ عجب تضاد ہے بلکہ مضحکہ خیز تضاد ہے کہ ۱۰ دسمبر کو جب ہم یومِ حقوقِ انسانی منا رہے ہوں گے ہم نے ۳ دسمبر کو شہر لاہور میں انتہائی بربریت کا مظاہرہ دیکھا کیا نابیناؤں کے حقوق بینا برادری کے مقابلے میں کم ہیں، کیا انہیں احتجاج کا حق حاصل نہیں، کیا انہیں

جینے کے لئے معاشی مشکلات درپیش نہیں، کیا ان کی خواہش نہیں کہ وہ بھی باعزت شہری کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر گزر بسر کریں۔ اگر ایسا ہے تو انہیں حقوق مانگنے کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ گزشتہ دنوں بہت سے بے بصر حضرات ہاتھوں میں ڈگریاں تھامے لاہور کی سڑکوں پر نظر آئے ان کا مطالبہ تھا کہ آخر انہوں نے تعلیم کس لئے حاصل کی یہ ڈگریاں کس لئے ان کے ہاتھوں میں ہیں، وہ چاہتے تھے کہ ان کے لئے ملازمتوں کے دروازے وا ہوں لیکن انہیں تو صدائے احتجاج بلند کرنے کی سزا ملی۔ پولیس کا تشدد سب نے دیکھا ہم اس کی مذمت کرتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ کوئی ۱۹۸۱ سے معذورین کیلئے ملازمتوں میں کوٹہ موجود ہے۔ پہلے یہ ایک فیصد تھا پھر دو فیصد ہوا لیکن بڑی حد تک یہ محض کاغذوں کی زینت بنا رہا اس پر عمل نہیں ہو پایا۔ اگر حکومت نے یہ کوٹہ دینے کا اعلان کیا ہے تو اسے عملی جامہ بھی پہنانا چاہیے۔ شنید ہے کہ ہنگامے کو دیکھ کر اب اسے ۳ فیصد کیا جا رہا ہے معلوم نہیں کہ زبانی جمع خرچ ہے یا قانونی طور پر اس کا نفاذ بھی کیا جائے گا۔ ہمیں توقع ہے کہ حکومت سنجیدگی سے کم از کم ان لوگوں کی مدد ضرور کرے گی جو اس لئے مدد کے نہایت مستحق ہیں کہ ان کے پاس زندگی گزارنے کے ذرائع کم سے کم ہیں۔ معاشرہ انہیں دوسرے درجے کے شہری تصور کرتا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی عزتِ نفس کو مجروح نہ ہونے دیا جائے اور انہیں ان کی قابلیت کے مطابق ملازمتیں دی جائیں اس طرح نہ صرف وہ کامیاب زندگی گزار سکیں گے بلکہ ابنائے وطن کے لئے بھی تحریک کا باعث بنیں گے۔

☆☆☆

رات گئی بات گئی

بالعموم دن کو مصروفیات اس قدر جان لیوا اور روح فرسا ہوتی ہیں کہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ مشینوں پر کام کرنے والے مشینوں کا ایک ادنیٰ سا پرزہ بن کر رہ جاتے ہیں اور دفاتر میں فرائض سرانجام دینے والے اکثر و بیشتر فائلوں میں ڈھیر ہو کر رہ جاتے ہیں، اپنی انفرادیت کھو بیٹھتے ہیں اور کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح خود بھی کاغذ کا ٹکڑا بن جاتے ہیں، دکاندار اپنی دکان میں دکان بن کر رہ جاتا ہے، اسے سکے گننے اور گاہکوں سے نبرد آزما ہونے سے فرصت نہیں ملتی اور شاید یہی حال ان طلبا اور طالبات کا ہوتا ہے جن کے سامنے منزل ہوتی ہے وہ کتابوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ مگر ان سب کیفیات سے وہ لوگ دوچار نہیں ہوتے جو محض کھانے کی خاطر جیتے ہیں اور زندگی کو دادِ عیش دینے کی فرصت گردانتے ہیں، انکے لئے تو سورج کے طلوع و غروب کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، ۲۴ گھنٹے در کنار سال کے ۳۶۵ دن بھی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور پوری زندگی اس طرح گزار دیتے ہیں جیسے انہیں زندگی ملی ہی نہ ہو اور پھر وہ اس خاک میں پیوست ہو جاتے ہیں جس نے انہیں جنم دیا تھا، لیکن ہم تو ان اصحابِ فکر و دانش اور ان اربابِ تگ و تاز کی بات کر رہے ہیں جو کچھ سوچتے بھی ہیں اور کچھ کرتے بھی ہیں یا یہ کہہ لیجئے کہ ان میں سے اکثر کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ جب رات ہوتی ہے اور انہیں فرصت کے چند لمحات میسر آتے ہیں تو یہ بڑے بڑے منصوبے بناتے ہیں، کئی بار شیخ چلی کی طرح خیالی قلعے تعمیر کرنے میں محو ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اب ہم محض کسی مشین کا کل پرزہ نہیں بن کر رہ جائیں گے اور نہ ہی فائلوں میں کھو کر رہ جائیں گے بلکہ کچھ نہ کچھ نیا کر کے دکھائیں گے، اپنے حالات کو بدلیں گے اور نئے ارادوں کے ساتھ دن کی سرحدوں میں داخل ہوں گے مگر پھر نیند انہیں گھیر لیتی ہے اور خواب کی دنیا میں کھو جاتے ہیں انہیں یاد تک نہیں رہتا کہ انہوں نے رات کیا منصوبے بنائے تھے، کیا ارادے کئے تھے

، چلیئے رات کی بات تو چھوڑیے اگر کوئی ہنگامی صورتحال پیدا ہو جائے تو یہ اس وقت سوچ میں گم ہو جاتے ہیں، احباب سے مشورے کرنے لگتے ہیں، بہت سے منصوبے بناتے ہیں لیکن ان کا حشر بھی وہی ہوتا ہے، جو رات کو منصوبے بنانے والوں کا ہوا کرتا ہے، کہیں آگ لگ گئی، کوئی زلزلہ آ گیا، کہیں دہشت گردی کا کوئی واقعہ رونما ہو گیا تو یہ مستعد اور چاق و چوبند ہو جاتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اعضا پھر مضمحل ہو جاتے ہیں۔

حضراتِ گرامی کچھ ایسا ہی حال وطنِ عزیز کے سپوتوں کا ہے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک جانے کیا کیا آفات رونما ہوئیں۔ کن کن بلاؤں نے آن گھیرا کچھ بلائیں آسمان سے نازل ہوئیں تو کچھ نے زمین سے سر اٹھایا اور جب بھی ایسا ہوا وطنِ عزیز کے باسی مضطرب ہو گئے، اربابِ بست و کشاد کو پر لگ گئے بڑی بڑی دھواں دار تقریریں کیں، بڑے دلکش منصوبے بنائے لیکن پھر معمول کے عفریت نے انہیں آلیا، یہ روزمرہ کی مصروفیات میں گم ہو گئے، کچھ دادِ عیش دینے لگے تو کچھ نانِ شبینہ کی تلاش میں لگ گئے اور سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

جب کوئی سیلاب آیا تو ساری قوم بیدار ہو گئی اور جونہی سیلاب گزرا قوم کے ارادے بھی ساتھ ہی گزر گئے۔ سیلاب پھر آیا، دیہات لقمہ اجل بن گئے، شہر درہم برہم ہو گئے مگر سیلاب گزر جانے کے بعد نہ کوئی پل بنا نہ کوئی بند بنا نہ شہری نظام درست ہوا اور نہ کوئی اور ایسا انتظام اور انصرام، جس سے آئندہ آنے والے سیلاب کا مقابلہ کیا جا سکے۔

قارئینِ کرام! سیلاب کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، قوموں کی زندگی میں سیلاب کئی انداز سے آتے ہیں اور ہمارے ملک میں سیلاب نے جو جو صورتیں اختیار کیں اس سے کون واقف نہیں صوبائیت کا سیلاب، فرقہ واریت کا سیلاب، عصبیت کا سیلاب بیماری کا سیلاب، غربت کا سیلِ بے پناہ اور سب سے بڑھ کر دہشت گردوں کی قیامت خیزیاں، جو کچھ حال ہی میں پشاور میں ہوا، ہم اس قیامت کو ابھی نہیں بھولے۔ لیکن شاید ہم بھولنے والی قوم ہیں، جب ہمارے منہ پر ایک

طمانچہ لگتا ہے تو ہمیں جوش آتا ہے اور پھر ہوش آجاتا ہے اور ہم دوسرا طمانچہ کھانے کے لئے اپنی رخسار کو تیار کر لیتے ہیں۔ ایسے افراد اور ایسی اقوام تا دیر زندہ نہیں رہ سکتیں جو اپنے ماضی سے کچھ نہیں سیکھ پاتیں۔ حال ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور مستقبل انہیں یکسر بھلا دیتا ہے۔

وطنِ عزیز میں سچ بولنا کسی گناہِ کبیرہ سے کم نہیں، اس لئے اس گناہِ کبیرہ سے ہمیں بھی بچنا ہے لیکن وہ وقت دور نہیں کہ سچ کا بول بالا ہوگا اور جھوٹ کا منہ کالا۔ آپ سچ بولئے یا نہ بولئے سچائی کو چھپایا نہیں جا سکتا، جو غلطیاں من حیث القوم ہم سے سرزد ہوئی ہیں ان سے ہر کوئی واقف ہے اور ہر کوئی ذمہ دار بھی۔

مگر ہوتا یہ ہے کہ حکمران عوام کو کوستے رہتے ہیں اور عوام حکمرانوں کو۔ اپنے گریبان میں جھانک کر کوئی نہیں دیکھتا شاید انہیں گریبان میں جھانکنے کی فرصت نہیں ہوتی یا جرأت ہی نہیں ہوتی۔ کون ہے جسے معلوم نہیں کہ وطنِ عزیز میں نام نہاد جمہوریت پرستوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں، کس طرح اداروں کو تباہ و برباد کیا ہے اور کس طرح پوری قوم مرگِ ناگہانی کے دہانے تک پہنچ گئی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ افواجِ پاکستان کو بعض طالع آزماؤں نے کس کس ڈھنگ سے استعمال کیا ہے۔ اس سے کون واقف نہیں کہ ہم میں سے کتنوں نے اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لئے ملکی مفادات کا سرِعام سودا کیا ہے، ملک کے پالیسی سازوں نے جو جو اغلاط کی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں قیامِ پاکستان سے تا دمِ تحریر جو کچھ آنکھ دیکھتی رہی ہے وہ لب پر نہیں آ سکتا۔ لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ نجانے کتنی آنکھیں ہیں جو سب کچھ دیکھ رہی ہیں اور سب سے بڑی آنکھ قدرت کی آنکھ ہے، وقت کی آنکھ اور زمانے کی آنکھ ہے جس میں ہم دھول نہیں جھونک سکتے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جائزہ لیں کہ وطنِ عزیز کی تخلیق میں کون کون سے عوامل تھے جو کارفرما تھے۔ علامہ اقبال اور قائدِ اعظم بین السطور کیا کہہ رہے تھے، یہ جاننے کی ضرورت بھی

ہے کہ وطنِ عزیز کا ایک بازو ہم سے کیوں علیحدہ ہو گیا اور باقی بازو بھی کیوں علیحدگی کا نعرہ بلند کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری حالت بڑی نازک ہے۔ بھارت نے اب تک سچے دل سے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا اور ہم میں سے اب بھی بہت سے قیامِ پاکستان کو مژدۂ جاں فزا نہیں سمجھتے۔ ہمارا سب سے بڑا دشمن ہماری اپنی کمزوری ہے، اپنی خود غرضی اور اقربا پروری ہے ہم جو سوچتے ہیں اسے وظیفۂ حیات بنانا چاہتے اور رات گئی بات گئی کے مصداق جو آفات ہم پر ٹوٹ رہی ہیں ان سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆☆

"جو بڑھ کر تھام لے خود ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے"

تاریخ کا سینہ ان اقوام و ملل اور افراد سے روشن ہے جنہوں نے شب ہائے تیرہ و تار میں اپنی ہمتوں کے چراغ جلائے، آرزوؤں کے دیئے روشن کئے، مساعی اور مسلسل تگ و تاز کے جھنڈے گاڑے، جو چل پڑے سو چل پڑے پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، آگے کی جانب بڑھتے گئے، بڑھتے ہی چلے گئے اور ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ پتھر کا زمانہ کمپیوٹر کے زمانے میں داخل ہوگیا، غاروں میں بسیرا کرنے والا مہ و مریخ میں بستیاں بنانے کے خواب دیکھنے لگا، پتوں سے تن ڈھانپنے والا برقی لباس زیب تن کرنے لگا اور یوں دیکھتے دیکھتے ہمت کے شناور خونخوار اور خوں آشام موجوں سے لڑتے ہوئے ساحلِ امید تک پہنچ گئے بلکہ اپنے ساتھ ہزاروں کو منزل آشنا کیا، مرادیں ان کی جھولیوں میں ڈال دیں اور تیرہ و تار راتوں کو بقعۂ نور بنا ڈالا۔ یہ سب کچھ کسی دیوانے کی بڑ نہیں، کون نہیں جانتا کہ جب ہمت اور قوتِ ارادی اور جرأت رندانہ اور شوق فضول نے خالد بن ولید، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کا تن بدن اوڑھا تو چار دانگ عالم میں ان کی آوازیں گونجنے لگیں اور انہوں نے ہر جانب صداقت محبت او راخوت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہ تو ان سپہ سالاروں کی بات ہوئی جن کا نام لے کر آج بھی زندگی اشہب ہمت پر سوار ہے اور دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ دنیا کے کسی میدان پر نظر ڈال لیجئے آپ کو مردانِ ہمت کے پاؤں کے نشان نظر آئیں گے۔ ایسے ایسے سپوت جنہوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی لیکن دنیا کو روشنی عطا کر گئے محبتیں بانٹیں اور مساوات کا درس دیا، ابراہم لنکن کی زندگی کا آغاز عسرت و افلاس سے ہوا لیکن پھر اس نے اپنی زندگی کے ایوان میں عزم و ہمت کے وہ چراغ روشن کئے کہ امریکہ کو غلامی کے عفریت سے مکمل طور پر نجات دلا دی۔ آیئے! امریکہ کی ایک اور دختر عظمت ہیلن کیلر کا ذکر ہو جائے جو نہ دیکھ سکتی تھی نہ سن سکتی تھی اور نہ

ہی بول سکتی تھی لیکن اس نے دنیا بھر کو گویائی اور بینائی عطا کی۔ بے بصر افراد کے لئے ایسے ہمت کے چراغ روشن کئے کہ جس کی روشنی میں وہ اپنی راہیں اب بھی تلاش کر رہے ہیں اور بہت سے تلاش کر کے اپنی منزلوں سے بغل گیر ہو چکے ہیں۔ مصر کے طٰہٰ حسین جو تین سال کی عمر میں بینائی کھو بیٹھے تھے ان کے علم و ادب کی شمعیں آج بھی کتب خانوں میں روشنی تقسیم کر رہی ہیں۔

ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا
وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا

کون جانتا تھا کہ افریقہ کا نیلسن منڈیلا دہشت گرد سے نوبل پرائز کا مستحق ٹھہرے گا اور دنیا اسے سلام کرے گی، کسے معلوم نہیں کہ برِ صغیر پاک و ہند میں جہالت، توہم پرستی اور ناانصافی کا دور دورہ تھا تو کچھ ایسے چراغ روشن ہوئے اور کچھ ایسے صاحبانِ ہمت میدانِ عمل میں کود پڑے کہ ہندوستان کی کایا پلٹ کر رکھ دی اس میں ایک نام بھگت کبیر کا ہے اور سینکڑوں نام ایسے ہیں جنہوں نے حبِ انسانیت کی جوت جگائی اور تصوف کا چولا پہن کر سب کو اپنے دامن میں چھپا لیا ایسے عظیم صوفیا کے نام رہتی دنیا تک قائم رہیں گے جنہوں نے ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ بلند کیا اور سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ حضرت علی ہجویریؒ کی خدمات کو کون نظر انداز کر سکتا ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی محبتوں کا کون قائل نہیں اور پھر پنجاب کی دھرتی نے نجانے کتنے ایسے سپوت جنم دیئے جن کی محبت کی شمعیں آج بھی روشن ہیں۔

ایسے میں اگر ہم اضمحلال کا شکار ہوں، قسمت کے دیوتاؤں کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں، بے بسی اور مجبوری کے بت تراش لیں اور ان کی پوجا پاٹ شروع کر دیں۔ حالات کے خوں آشام پنجوں کی زد میں آجائیں، اگر ہمیں تشکیک کے اژدہا نگلنے لگیں، اگر ہم توہم کے لق و دق صحراؤں میں کھو کر رہ جائیں، اگر ہم تعصب کا لقمہ بن جائیں اور اگر فرقہ پرستی کے مگرمچھ ہمیں اپنا نوالہ بنا لیں، اس میں قصور کس کا ہے، کون موردِ الزام ہے۔ ہم ہر بات کل پر چھوڑنے لگیں، ٹال مٹول کرنے لگیں کہنے لگیں "نہیں نہیں" قسمت کا جبر ہمیں جینے نہیں دیتا" پکار اٹھیں "ہم تو بے

بس اور مجبور ہیں" یا اپنے شاعر میر تقی میر کے ایک اداس لمحے میں کہے ہوئے شعر کو وظیفۂ حیات بنائیں کہ

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں جو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

اور اقبالؒ کے اس نعرۂ مستانہ کو سننے سے انکار کردیں۔

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

تو کس کا قصور ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے لیکن ان کے استعمال کا اختیار خود ہمارے پاس ہے۔ وہ حالؔی نے کہا تھا!

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

یا پھر بقول شاعر

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ کر بھی چل دیے
ہم جا ہی ڈھونڈتے تیری محفل میں رہ گئے

جگہ ڈھونڈنے والوں کو جگہ مل ہی جاتی ہے۔ ڈھونڈنے والے نئے جہانوں کو تلاش کر ہی لیتے ہیں، نئے زمین و آسمان ان کے منتظر ہوتے ہیں۔ وہ ہر لحہ نئے طورِ نئی برقِ تجلی کے خواہاں ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ شوق کبھی کم نہیں ہوتا۔ قارئینِ کرام! میں نے تو ہمت کے معجزے خود اپنی زندگی میں دیکھے ہیں۔ جب حالات ایسے ہو گئے، جب ہمت توڑنے والے، حوصلوں کے چراغ گل کرنے والے، نومیدی کا درس دینے والے، یاسیت کے پجاری میرے اردگرد تھے تو جانے کس نے میرے ہاتھ میں شمعِ ہمت تھمادی اور میں نے بے بصری کے تمام بت پاش پاش کر دیے، اندھیروں میں اجالے نظر آنے لگے۔ اس میں یقیناً میرے والدِ محترم اور میرے اساتذہ کرام کا

ہاتھ تھا لیکن اصل چراغ تو اپنے دل میں فروزاں ہوتا ہے، اپنے ہی دماغ میں جلتا ہے۔ یہی نہیں زندگی میں جانے کتنی آندھیاں آئیں، کتنے طوفان اُٹھے کتنی بے وفائیوں نے مجھے ریزہ ریزہ کرنے کی کوشش کی، کتنی رکاوٹیں سنگِ راہ بنیں کتنے اعزا و اقربا راہ میں حائل ہوئے لیکن میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یقین اور اعتماد کی شمع روشن رکھی، ہمیشہ روشن رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، اگر ایک چراغ بجھ بھی گیا تو دوسرا اجالا لیا، ایک شمع گل بھی ہوئی تو دوسری روشن کرلی، امید نے میرا دامن نہیں چھوڑا، میں کئی بار سر کے بل گرا، پاؤں میں موچ آئی، کمرِ ہمت جواب دینے لگی لیکن پھر ہاتفِ غیبی نے کہا۔ لا تقنطو من الرّحمۃ اللہ۔ اٹھ کھڑا ہو۔ چل پڑ، کمرِ ہمت باندھ، اپنے راہوارِ آرزو پر سوار ہو جا، پیچھے مت دیکھ، آگے چل، چلتا رہ کہیں مت رُک، تجھے بہت سے کام کرنے ہیں بہت سے در، وا ہوں گے، بہت سی کھڑکیاں اور روزن کھلیں گے اور زندگی کا حبس کافور ہوجائے گا اور میں فراسٹ کی یہ سطور پڑھتے ہوئے آگے بڑھتا گیا بڑھتا ہی گیا۔

The woods are lovely dark and deep
But I have promises to keep
And miles to go before I sleep
And miles to go before I sleep.

قارئین کرام! میرے اردگرد تو کوئی دل کش اور دل آویز نظارے بھی نہ تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی آسیب ہے جو میرا پیچھا کر رہا ہے لیکن میں چلتا رہا، چلتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا اور جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں اور سب کو بھی یہی جان لینا چاہیے۔

"جو بڑھ کر تھام لے خود ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے"۔

☆☆☆

غزل اس نے چھیڑی

یہ غزل بھی عجب ڈھیٹ شے ہے، اس کے انداز بھی انوکھے ہیں، کم بخت بُرا بھلا سنتی ہے پھر بھی پھلتی پھولتی ہے، کسی نے اس کو گردن زدنی قرار دیا، کسی نے اسے وحشی صنف گردانا لیکن اس کی پیشانی پر بل ہی نہیں آیا، پھلتی رہی، پھولتی رہی جبکہ بہت سی اصناف معدوم ہو گئیں، صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں مگر غزل شاعری کا سنگھار بنی رہی، جذبوں کا ہار بنی رہی۔

حال ہی میں چند احباب کے تاثرات نظر سے گزرے یا کہہ لیجیے سماعت سے گزرے "وہی پرانی باتیں وہی پرانے خیالات بھلا اسے بھی شاعری کہا جا سکتا ہے" کسی نے کہا "لوگ دھڑا دھڑ شعری مجموعے چھپوا رہے ہیں بات کچھ بھی نہیں، خواہ مخواہ دہرائے چلے جا رہے ہیں" کوئی اور بولا۔ اور جانے کیا کیا کچھ "اور" کہتے رہتے ہیں لیکن غزل ان کی ایک نہیں سنتی، اپنی دھن میں گاتی ہے اپنے رنگ اور ڈھنگ سے اپنی راہیں متعین کرتی ہے، وہ ایسا کیوں نہ کرے کیونکہ اس کا تعلق بنیادی انسانی جذبات سے ہے۔ آنسوؤں سے، آہوں سے، جذبوں سے، احساسات سے، وصل سے فراق سے، ہمت سے، آرزو سے، تمنا سے اور جانے کس کس سے، یہ سب جذبے، یہ سب احساسات وقت کے ساتھ ساتھ، مادیت کے جبر کے باوجود ماند نہیں پڑ سکے، مٹ نہیں سکے۔ جب کوئی کسی سے جدا ہوتا ہے اب بھی اسی طرح ملول ہوتا ہے جیسے صدیوں پہلے---ہزاروں سال پہلے---جانے کب سے!

جب کوئی وصل کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے تو اس کی سرشاری اور شادمانی ویسی ہی ہوتی ہے جو صدیوں پہلے تھی۔ ایڈی پس اپنے المیے پر اسی طرح سوگوار ہوتا ہے جیسے کہ ہیملٹ، کنگ لیئر، اوتھیلو، شہزادہ سلیم، انارکلی، بیمیس خان، میں تم اور آپ بھی، آپ بھی جو غزل میں کچھ نیا چاہتے ہیں جو غزل کو گردن زدنی تصور کرتے ہیں، کیا آپ نے رونے کا کوئی نیا انداز اپنا لیا ہے

کیا؟ آپ کے ہونٹوں پر تبسم نے کوئی نویلا انداز اختیار کر لیا ہے؟ کیا رات کو جب بےقراری آپ کو آن لیتی ہے اور آپ بستر پر کروٹیں لیتے ہیں تو آپ نے اپنی بےقراری کے اظہار کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کر لیا ہے۔ سینکڑوں سال پہلے بھی منہ پر طمانچہ لگنے کی آواز وہی تھی جو آج بھی ہے، معانقہ کرنے پر دل اس طرح دھڑکتا تھا جیسے آج دھڑکتا ہے، پہلی محبت کی سرشاری بھی اسی طرح ہے اور پہلی محبت کی شکست بھی اس طرح اذیت ناک ہے، محبوب دل و نظر آج بھی اسی طرح حسین ہے جیسے سینکڑوں سال پہلے تھا پھول ویسے ہی دل آویز ہیں جیسے پہلے تھے، چاندنی راتوں کی کشش بھی تغیر پذیر نہیں، صبح کا منظر بھی ہمیشہ کی طرح دل آویز اور روح پرور ہے۔

اگر غزل انسانی جذبات کا بے ساختہ اظہار ہے، اگر تصنع اور بناوٹ سے بے نیاز ہے، اگر غزل کی دنیا دل کی دنیا سے منسلک ہے اور روح کے ساز سے ہم آہنگ ہے تو پھر آپ اس سے من مرضی کا تقاضہ نہیں کر سکتے شعر جذبوں کی طرح غیر متغیر ہوتے ہیں، اس لئے غزل کو مطعون کرنا اور غزل گوؤں کو ناپسند کرنا ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا۔

سرسید نے کہا تھا کہ جب کسی کے گھر میں آگ لگی ہو تو وہ تشبیہوں اور استعاروں کا متلاشی نہیں ہوتا بس مدد کے لئے پکارتا ہے، اسی طرح ڈاکٹر جانسن نے جان ڈن پر اعتراض کیا تھا کہ اس کی تشبیہات اور استعارے دور از کار ہیں فطری نہیں، اسی طرح اس نے Lycidas کے حوالے سے کہا تھا کہ کسی دوست پر نوحہ لکھتے وقت کوئی دور کی کوڑی نہیں لاتا جیسا کہ ملٹن نے کہا تھا اسی طرح حسرتؔ نے کہا تھا کہ

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

ہماری رائے میں شعر دراصل وہی ہیں جو سچے جذبوں کا بے ساختہ اظہار کرتے ہوں، چنانچہ لوگ غزل کہتے چلے جائیں گے جب تک آنسو بہیں گے، آہیں بلند ہوں گی، درد جھلکیں گے، جدائی قیامت خیز رہے گی، وصل کی شیرینیاں قائم رہیں گی، آرزو کے چراغ جلتے رہیں گے اور

ہمتوں کے کارواں رواں دواں رہیں گے۔ ہاں! ایسا ممکن ہے کہ ہمارے نقادانِ ادب کا مسئلہ کچھ ایسا نہ رہا ہو، ہاں بعض اوقات ایسا ضرور ہوتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ جذبے ماند پڑ جاتے ہیں، اس میں جذبوں کا نہیں عمر کا قصور ہے، آج بھی نوجوان جن کی تعداد وطنِ عزیز میں ۶۰ فیصد ہے انہی کیفیات سے دوچار ہیں جن کا اظہار غزل کا سرمایہ ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کا عمر نے کچھ نہیں بگاڑا۔ اب بھی وہ پھول مانگ میں سجاتے ہیں، کالر میں ٹانکتے ہیں، آج بھی تازہ ہوائیں انہیں تازہ دم کر دیتی ہیں، آج بھی حسین چہرے انہیں حسن کی داد پر آمادہ کرتے ہیں۔

چنانچہ ہماری رائے میں شاعری ہوتی رہے گی آپ کو بھلے اچھی لگے نہ لگے، کیونکہ اس کے قارئین میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، آج بھی میرؔ زندہ ہے، غالبؔ آج بھی دلوں کی دھڑکن ہے، فیضؔ آج بھی زندگی عطا کرتا ہے فرازؔ آج بھی من کو بھاتا ہے، یہ تو بڑے شاعروں کی بات ہوئی، شاعر بڑے چھوٹے ہوتے ہوں گے لیکن جذبے بڑے چھوٹے نہیں ہوتے، کسی چھوٹے شاعر کو بھی بڑا جذبہ متحرک کر سکتا ہے اور کوئی بڑا شعر تخلیق ہو سکتا ہے اور آج بھی کوئی غزل چھیڑ سکتا ہے۔۔۔ سچے جذبوں کی غزل۔۔۔ زندگی کی غزل۔۔۔ غزل ہی غزل۔۔۔ غزل غزل زندگی۔

☆☆☆

اُف یہ صبحیں، اُف یہ شامیں

قارئین کرام! بہت پہلے ہمارا شاعر کہہ گیا تھا

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

بڑی حد تک وہ سچ ہی تو کہہ گیا تھا ہمارے عہد کا بہت بڑا المیہ ہے کہ قناعت کوسوں دور ہے، قرار ہمیں بی کو نہیں، ہم ساری دنیا کی دولت اپنے دامن میں بھر لینا چاہتے ہیں کسی اور کے دامن میں چاہے کچھ بھی باقی نہ رہے، اپنا ہی دامن بھر لینے کا عمل کوئی اتنا صحت مندانہ بھی نہیں بلکہ انتہائی مہلک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہم صبح سے شام اور شام سے صبح ایک مشین کا گھٹیا پرزہ بن کر رہ گئے ہیں، دوڑتے ہیں تو دوڑتے چلے جاتے ہیں، ہمیں اپنی منزل تک بھول جاتی ہے لیکن دوڑ ختم نہیں ہوتی ایسے میں ہم اپنی واپسی کا راستہ بھی فراموش کر دیتے ہیں۔

یہاں مجھے اپنے دو شعر یاد آرہے ہیں۔

دنیا کو نئی راہ نئی سمت دکھا کر
لوٹے ہیں تو ہم اپنا ہی گھر بھول گئے ہیں
اس دھن میں کہ چونکائیں گے ہم بزم کو جا کر
دوڑے ہیں کچھ اس طرح خبر بھول گئے ہیں

گویا

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

نہ ہی سکوں باقی رہا اور نہ ہی کچھ ہاتھ لگا، میں تنگ و تازِ حیات کے مخالفین میں سے نہیں

، میں تو جدو جہد اور سعیِ پیہم کا دل و جان سے قائل ہوں، میں بھی ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی کا حامی ہوں لیکن میں اس چیز کا حامی نہیں اور نہ شاید کوئی صاحبِ فہم ہو سکتا ہے کہ اس دوڑ دھوپ میں ہم بند رکی طرح دوڑتے ہی رہیں اور کچھ ہاتھ نہ لگے، کچھ ہاتھ نہ آئے ۔ اسے ۱۹ ویں صدی کے شاعر اور نقاد میتھیو آرنلڈ نے Sick Hurry کا نام دیا تھا اور ایسے اشخاص کے بارے میں بیسویں صدی کے شاعر اور نقاد ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ وہ شخص ایسا ہوتا ہے جیسے کسی کو آپریشن تھیٹر میں آپریشن کے لئے بے ہوش کر کے لٹا دیا گیا ہو، میں صمیم قلبی سے اس بات کا قائل ہوں کہ ہمارا آج، کل سے بہتر ہونا چاہیے اور ہمیشہ خوب سے خوب تر کی کوشش کرتے رہنا چاہیے ۔ مگر خوب تر کی تلاش میں بلکہ خوب ترین کی تلاش میں جو کچھ ہمارے پاس ہے اسے بھی گنوا دینا کہاں کی دانش مندی ہے ۔ کوشش کیجئے کہ کوشش کرنا حکمِ ایزدی ہے زندگی کے تجربے کا نچوڑ ہے، اس کوشش سے تاریخ کا سینہ روشن ہے لیکن اس دوڑ دھوپ میں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے آپ کو گنوا دیں ہمیں اپنی شناخت بھی نہ رہے، ہم اپنا نام تک بھول جائیں، کام تک بھول جائیں، ہمیں اپنے بیگانے کی پہچان تک ہی نہ رہے اور ہمیں دولت کا اژدھا نگل جائے، ہم شہرت کے صحراؤں میں کھو جائیں اور خواہش ہماری تکہ بوٹی کر دے، رات کی نیند ہم سے چھن جائے اور دن کا آرام ۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ناں!

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

کیونکہ عقل عیار ہے اور نت نئے بھیس بدل لیتی ہے اور بسا اوقات ہمی کو اپنا نوالہ بنا لیتی ہے ۔ ہم کام کریں محنت کریں لیکن کچھ وقت اپنے لئے اور اپنوں کے لئے بھی بچا رکھیں ۔ کبھی دل کی بھی سن لیں اپنے آپ سے مکالمہ کریں، کبھی ہواؤں کے نغموں سے لطف اندوز ہوں کبھی دریاؤں کی روانی کے گیت سنیں، کبھی ستاروں کے ساتھ ہم کلام ہوں کبھی خوشبوؤں اور رنگوں سے آنکھ مچولی کھیلیں، کبھی کوئی خوشبو جیسی بات کریں، کوئی پیار کا بول بولیں، کوئی پیار کی بات سنیں، کبھی

اپنے ننھے بچے کی پیاری پیاری میٹھی میٹھی باتیں سنیں، کبھی اپنے گھر کی رونق میں اضافہ کریں، کبھی عمرِ رفتہ کو آواز دیں، شیریں یادوں میں کھو جائیں، کبھی آنکھوں میں خواب سجائیں، کبھی فنونِ لطیفہ سے لطف اندوز ہوں، شعر کہہ سکتے ہوں تو شعر کہیں، مصوری کا شوق ہے تو تصویروں میں کھو جائیں، موسیقی سنیں اور زندگی کے نغموں سے لطف اندوز ہوں اور پھر اس طرح ہم میں وہ قوت، وہ طاقت اور وہ صلابت پیدا ہوگی کہ ہم زندگی کی دوڑ میں ہانپنا چھوڑ دیں گے ۔ ہم دوڑیں گے ضرور مگر دوڑتے دوڑتے منہ کے بل نہیں گریں گے، ہم چلتے جائیں گے منزل ہمارے سامنے ہوگی یہی ہمارے دین کی تعلیم ہے اور یہی کچھ ہم نے زندگی سے سیکھا ہے وہ انگریزی شاعر William Henry Davies نے کہا تھا

What is this life if full of care,
We have no time to stand and stare,

یعنی یہ کیا زندگی ہوئی کہ ہم ہمیشہ پریشانیوں کا شکار رہیں اور زندگی کے رنگ و روپ سے لطف اندوز نہ ہو سکیں ۔ یورپی اقوام نے شاید اس لئے بھی ترقی کی ہے کہ وہ کام اور آرام کی اہمیت کو سمجھتی ہیں جب یہ افراد کام کرتے ہیں تو آرام بھول جاتے ہیں اور جب آرام کرتے ہیں تو کام کا بھوت ان کے سر پر سوار نہیں ہوتا ۔ Russell نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عجیب ہیں ہم لوگ کہ گناہ کرتے وقت ہمیں ثواب کا خیال آتا ہے اور ثواب کرتے وقت ہمیں گناہ اپنی طرف کھینچتا ہے ۔ نہ ہم اطمینان سے کوئی اچھائی کر سکتے ہیں اور نہ ہی تفریحِ طبع ۔ یہ تو Russell نے ان کے بارے میں لکھا تھا جو جنگِ عظیم اول اور دوم کا شکار ہوئے تھے لیکن بحیثیت مجموعی ترقی یافتہ اقوام نے کام اور آرام کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لیا ہے یہ افراد دن بھر کام کرتے ہیں اور رات کو آرام سے سوتے ہیں، پانچ دن یہ ہوتے ہیں اور انکا کام اور پھر دو دن یہ ہوتے ہیں اور ان کا آرام ۔ لیکن مشرقی اقوام میں یہ توازن پیدا نہیں ہوا، کچھ دنیا میں کھو کر رہ گئے ہیں اور کچھ نے دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے ۔ کچھ دو اور دو چار میں کھو گئے اور کچھ سرے سے دو اور دو چار کے قائل

ہی نہیں رہے، سادھو بن گئے، صوفی بن گئے، دنیا چھوڑ دی، اپنے چھوڑ دیئے بلکہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئے اور کچھ ایسے ہوئے کہ جنہوں نے کاروبار کے سوا کچھ اور نہ سوچا، کاروبار ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا، ان کی شخصیت ہندسوں میں تبدیل ہو گئی، اعداد میں کھو گئی لفظوں کا گورکھ دھندہ بن گئی، باقی کچھ نہ بچا، یہ ایک بڑا المیہ ہے اس کو دوہری شخصیت یعنی Split Personality کا نام دیا گیا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا تھا کہ بڑا شاعر وہ ہے جو اپنے افکار کو محسوس کر سکتا ہے اور اپنی محسوسات پر غور کر سکتا ہے یعنی نا تو وہ عقل کا غلام ہوتا ہے اور نہ ہی محض جذباتیت کا، اس آہنگ کے فقدان نے ہم سے سب کچھ چھین لیا ہے کوئی تارک الدنیا بن گیا ہے تو کوئی دہشت گرد، کوئی کروڑ پتی ہے تو کسی کے پاس نانِ شبینہ بھی نہیں۔ معاشرہ طبقوں میں بٹ گیا ہے انسان کے کئی ٹکڑے بن گئے ہیں، کتنا بڑا المیہ ہے سوچئے، ذرا سوچئے!

☆☆☆

پڑھا لکھا پاکستان؟

کوئی چاہے بھی تو اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ تخلیقِ پاکستان شعور و آگہی کی رہینِ منت ہے۔ سر سید احمد خان کی کاوشیں اور مساعی بار آور ہوئیں، مسلم لیگ نے سر سید کا بلند کیا ہوا پرچم سنبھالا اور پھر صحافت، سیاست اور قلمی جہاد کے ذریعے قیامِ پاکستان کا معجزہ ممکن ہوا پاکستان کسی جنگ و جدل کے نتیجے میں معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ مسلمانانِ برصغیر نے قلمی جہاد کے ذریعے یہ خواہش پایۂ ثبوت کو پہنچائی تھی کہ پاکستان کا قیام کیوں ناگزیر ہے! پھر علامہ اقبال جیسے نابغۂ روزگار نے علم و آگہی کی وہ شمع روشن کی جسے وقت کی آندھیاں کسی طور بجھا نہ سکیں اور جس کی روشنی تیز تر ہوتی چلی گئی۔ خود حضرت قائدِ اعظم جنگ و جدل کے قائل نہ تھے انہوں نے اپنے شعور و آگہی کی بنیاد پر قراردادِ پاکستان ہی کو نہیں بلکہ قیامِ پاکستان کو بھی ممکن کر دکھایا، پاکستان انہی اہلِ قلم اور اہلِ فکر کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ ہے وگرنہ صورتِ حال بڑی مخدوش تھی۔ علامہ اقبال اپنے دور کے تعلیمی نظام سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق خلوتیانِ مے کدہ کم طلب و تہی کدو

وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مروجہ تعلیمی نظام جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو ہی نہیں سکتا، وہ مدرسہ دیوبند کی کارکردگی سے بھی مطمئن نہیں تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلمانانِ برصغیر عصری تقاضوں کو کماحقہٗ سمجھیں اور ان کا دماغ اس تعلیم سے منور ہو جس کے باعث اسلامیانِ برصغیر اپنی زندگیوں کو تابناک بنا سکیں۔

علامہ اقبال کے افکار انتہائی فکر انگیز ہیں لیکن شومئی قسمت سے ان افکار کو پسِ پشت ڈال دیا گیا اور محض اقبال کے چند اشعار کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیا گیا اور وہ بھی ایسے اشعار جو

استحصال پسندانہ نظام کو سازگار تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کئی تعلیمی کمیشن قائم ہوئے، سفارشات آتی رہیں لیکن صورت حال تبدیل نہ ہو سکی، حصولِ تعلیم مقصدِ اول نہ رہی بلکہ ڈگریوں کا حصول جاذبِ نظر حقیقت بن گیا، مقاصد کو نظر انداز کر دیا گیا اور تعلیم کو محض اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ اداروں میں طوطے کی طرح رٹنے کو ہی تعلیم گردان لیا گیا، چند سوالات رٹ لیجئے امتحان میں جایئے اور پاس ہو جایئے، نہ استعداد، نہ ذہانت، نہ تربیت اور نہ ہی علم کی وہ توانائی اور قوت جو قوموں کو زندگی عطا کرتی ہے۔ صورتحال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی، تعلیم کو پرائیویٹائز کر دیا گیا اور اب جو صورتحال ہے اس سے کون واقف نہیں تعلیمی ادارے زراندوزی کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ تعلیم کی کاروباری منڈیاں بن گئی ہیں اور ان کے اربابِ حل وعقد انہیں روپیہ بنانے کی ٹکسال گردانتے لگے ہیں انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی تعلیم حاصل کرتا ہے کہ نہیں انہیں تو ڈھیروں فیس چاہیے اور کیونکہ ان کے پاس دینے کے لئے ڈھیروں ڈگریاں ہیں۔

مزید برآں سمسٹر سسٹم نے تعلیمی انحطاط کے تابوت میں آخری کیل گاڑ دی ہے۔ داخلہ لیجئے اور بس! کلاسز اٹینڈ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، کچھ اہم سوال تیار کر لیجئے، آپ کے ہاتھ میں ڈگری ــــ بلکہ ۸۰/۸۵ فیصد نمبر حاصل کر کے آپ پھولے نہیں سماتے، کمال ہو گیا، الہٰ دین کا چراغ ہاتھ لگ گیا۔ جب چاہئے جہاں سے چاہیے ڈگری خرید لیجئے، یہ طریقہ انتہائی اندوہناک ہے اور قومی مفادات کے لئے سم قاتل۔ پھر معروضی طرزِ تعلیم نے ہماری رائے میں تعلیم کے معیار کو انتہائی پست کر دیا ہے، خود سوچنے کی صلاحتیں مفقود ہو کر رہ گئی ہیں، تخلیقی عمل رک کر رہ گیا ہے، بس اعداد و شمار ذہن میں رکھ لیجئے، کچھ حقائق رٹ لیجئے، کچھ اندازے لگانا سیکھ لیجئے، آپ کے وارے نیارے ہیں۔

پاکستان میں مواصلاتی تعلیم نے بھی انتہائی گھناؤنا کردار ادا کیا ہے۔ داخلہ لینے کے بعد چند سوالات اور چند کتب ارسال کر دی جاتی ہیں کوئی اسائنمنٹ لکھ رہا ہوتا ہے اور کسی اور کو نمبر مل رہے ہوتے ہیں اور اسائنمنٹ بھی دی گئی کتب کا چربہ ہوتی ہے، وہاں سے نقل کیجئے عقل کی

چنداں ضرورت نہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس نظام میں بھی کچھ ایسے جنونی طلباء ہوں جو اپنی تعلیمی استعداد کو بڑھانے کو ہی اپنا مطمع نظر سمجھتے ہوں۔ مگر ایسے طلبا کی تعداد ہمارے دور میں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

دراصل ہماری قوم کے اذہان سے تعلیم کی اہمیت کا احساس ہی محو ہوتا جا رہا ہے، ڈگریوں کو ہی مطمع نظر سمجھا جاتا ہے اور ڈگریوں کے حصول کے بھی بہت سے ذرائع تلاش کر لئے گئے ہیں اگر ماہرینِ تعلیم نے اس صورتحال کو من عن رہنے دیا تو وہ وقت دور نہیں کہ جہالت کے اندھیرے ہم سب کو نگل لیں گے اور ہم من حیث القوم تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے۔ اسلامی نقطہ نظر سے حصولِ تعلیم کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور ترقی یافتہ اقوام کی حیرت انگیز کامیابیوں نے یہ حقیقت اظہر من الشمس کر دی ہے کہ تمام ترقی، تمام ارتقاء، تمام فتوحات اور تمام طاقت کا انحصار علم پر ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اربابِ اختیار اب بھی احساس کریں تا کہ ہم کسی قومی المیے سے بچ سکیں۔ جہالت تنگ نظری مفاد پرستی پہلے ہی ہماری رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے اور ہم من حیث القوم تباہ و برباد ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ خوفناک فرقہ پرستی، خونخوار دہشت گردی، ہولناک صوبائیت، یہ سب جہالت اور لاعلمی کے شاخسانے ہیں۔ علم اور آگہی تو ایک قوم کو وہ عظمتیں اور رفعتیں عطا کرتی ہیں جو تاریخ کا سینہ روشن کر دیتی ہیں، ہماری رائے میں تعلیم کے مروجہ نظام کو یکسر تبدیل ہونا چاہیے اور ہم میں سے ہر ایک کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ تعلیم سے بے پروائی ہمیں بڑی مہنگی پڑے گی اور ہم قوموں کی صف میں کبھی باعزت مقام حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس موضوع پر لکھنے کے لئے بہت کچھ موجود ہے لیکن محض لکھ دینے سے بات نہیں بنے گی ایک احساس اجاگر ہونا چاہیے کہ کیا ہم ایک باغیرت قوم کی طرح زندہ رہنا چاہتے ہیں، کیا ہم آنے والی نسلوں کو تابناک مستقبل دینا چاہتے ہیں؟ کیا ہم اپنی موجودہ مشکلات پر قابو پانا چاہتے ہیں؟ کیا ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے؟ کیا ہماری خواہش ہے کہ ہم پھر سے سر اٹھا کر چل

سکیں؟ کیا ہم چاہتے ہیں کہ اعلیٰ اقدار کا احیاء ہو؟ محبت کی حکمرانی ہو، اخوت کی فراوانی ہو اور پھر ہم اسلامی سنہری دور میں داخل ہو سکیں، جب مسلمان ہونا فخر کا باعث تھا، عزت کا باعث تھا، کیونکہ ایک مسلمان ایک ایسا انسان ہوتا ہے، جس کی زبان اور قلم کے ذریعے کسی کو دکھ نہیں پہنچتا اور جو سب کے لئے سراپا رحمت، سراپا عفوو درگزر اور سراپا محبت ہوتا ہے۔

☆☆☆

نصابی مسائل

یوں تو وطنِ عزیز مملکتِ خداداد ان گنت مسائل کی آماجگاہ ہے اور ہنوز ہم اس کی تخلیق کی غرض اور مقصد پر اور ہر فورم پر بحث تمحیص میں لگے رہتے ہیں ایسی بحث جس کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا، چلئے ہمیں نا امید نہیں ہونا چاہیے، اتنی مدت گزر گئی ہے کچھ اور گزر جانے دیجئے، مقصدِ تخلیقِ پاکستان متعین ہو ہی جائے گا لیکن پاکستان تو ایک حقیقت ہے اور اسے ایک حقیقت ہی رہنا چاہیے کیونکہ اس کے باسی حقیقت میں گوشت پوست کے انسان ہیں جن کا کوئی ماضی، حال اور مستقبل ہے آرزوئیں اور تمنائیں ہیں، خواب ہیں اور نصب العین ہے، چاہے وہ نصب العین کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو، ہے تو سہی۔ اب اس نصب العین کے حصول کو حقیقت بنانے کے لئے اور ۱۸ یا ۲۰ کروڑ جیتے جاگتے انسانوں کو سچ مچ انسان بنانے کے لئے مہذب قوم بنانے کے لئے قوموں کی صف میں عزت و تکریم دلانے کے لئے جس امر کی سب سے پہلے ضرورت ہے وہ تعلیم ہے۔ تعلیم ہی انسان کو تحت الثرا سے اوجِ ثریا پر پہنچا دیتی ہے، تعلیم ہی جانور کو انسانی روح اور جسم عطا کرتی ہے، اسے سمت دیتی ہے، اسے صلابت عطا کرتی ہے، اس میں کچھ کرنے اور کچھ کر گزرنے کی سکت پیدا کرتی ہے۔ تعلیم کے کرشمے ہم سب کے سامنے ہیں۔ تعلیم کی وجہ سے یورپ دنیا کا آقا بن گیا ہے اور مشرقی اقوام اگر اس کی دستِ نگر ہیں تو تعلیم کے فقدان کی وجہ سے۔ اسلام کا عروج بھی تعلیم ہی کا رہینِ منت ہے اور زوال بھی تعلیم کے فقدان کی وجہ سے واقع ہوا ہے۔ تعلیم کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن ہی نہیں، بے شمار قرآنی آیات، احادیثِ نبویؐ علماء اور فقہا کے افکار سب تعلیم کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں لیکن کچھ بدقسمتی یہ ہوئی کہ ارضِ پاک کے باسی تعلیم کی اہمیت کا ادراک نہیں کر پائے، اس کی بہت سی وجوہات میں ایک یہ بھی ہے کہ ہزاروں سال سے ہم غلام ذہن کی پرورش کرتے رہے ہیں۔ ہزار سالہ بادشاہت نے ہمیں تعلیم

سے بے بہرہ ہی رکھا کیونکہ تعلیم یافتہ قوم کو غلام رکھنا کوئی آسان نہیں ہوتا اور بادشاہت غلامی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی چنانچہ شعوری یا لاشعوری طور پر شہنشاہوں، سلاطین اور بادشاہوں نے تعلیم کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا اور پھر یہ حضرات خود تعلیم کے بل بوتے پر بادشاہ اور شہنشاہ نہیں بنے تھے بلکہ تلوار کے زور پر یا وراثت کی طاقت سے یہ سب عروج اور بلندی انہیں حاصل ہوئی تھی۔ پھر فرنگی در آئے انہوں نے تعلیم کے صرف اس پہلو پر زور دیا جو انہیں درکار تھا، انہیں دفتروں میں کام کرنے والے اہلکار چاہئیں تھے سو انہوں نے تعلیم کو اقدار اور کردار سازی کا ذریعہ بنانے کی بجائے ایک ہنر سمجھا۔ دریں اثناء قبائلی اور جاگیرداری نظام مضبوط ہو گیا اور اس نظام کی بقا کا انحصار اسی امر پر تھا کہ عوام زیورِ علم و ہنر سے آگاہ ہی نہ ہوں بعض علماء بھی نہیں چاہتے تھے کہ لوگ قرآنی تعلیم سے بہرہ ور ہوں تا کہ ان کی مرضی کا اسلام ان کے مفادات کی تکمیل کرتا رہے۔ یہی عالم بہت سے اور طبقوں کا تھا جو ملکی جہالت کی وجہ سے اور اقتصادی بدحالی کی وجہ سے طاقت حاصل کر چکے تھے۔ شکر ہے کہ اب ذرائع ابلاغ پر کچھ تعلیم کی شنوائی ہونے لگی ہے، ہم تعلیم کی اہمیت کی بات کرنے لگے ہیں لیکن اب بھی ہم میں سے بہت سے احباب تعلیم کے اصل مقاصد سے مطلقاً ناواقف ہیں۔ اب بھی وہ تعلیم یافتہ افراد کی بجائے ربوٹس تیار کرنے کے حق میں ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ دماغ مت سوچے، ان کی خواہش ہے کہ ان کی حکمرانی قائم رہے اور لوگوں میں شعور اور آگہی ہرگز نہ آنے پائے، اس سے ان کی ساری سلطنت، ساری حکمرانی اور قوت و عظمت ملیامیٹ ہو جائے گی۔

اس وقت محلِ نظر ایک اہم مسئلہ ہے وہ مسئلہ نصابِ تعلیم ہے سننے میں آتا رہتا ہے کہ وطنِ عزیز میں ایک ہی نصابِ تعلیم ہو، ایک ہی طرح کی تعلیم ہو مگر کیا ایسا ممکن ہے۔ جدید تعلیمی نظریات کے مطابق ہر فرد کا ذہن ایک مخصوص انداز سے نشوونما پاتا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ ایک فرد کو دوسرے فرد کا Prototype بنا دیں۔ ہر فرد اپنی سوچ رکھتا ہے، اس کی اپنی فکر ہے، تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان ذہن کو آزادانہ سوچ کے قابل بنایا جائے۔ اگر تمام پاکستانی

طلباء پر ایک ہی نصاب لازم قرار دے دیا جائے تو آزادانہ فکر کسمسا کر رہ جائے گی، تخیل کا کنول مرجھا کر رہ جائے گا، سوچ کے آزادانہ سوتے کبھی نہیں پھوٹیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ نصاب میں تنوع ہو، ہمارے چار صوبے ہیں، ہر صوبے کا اپنا جغرافیہ، اپنی ثقافت اور اپنی زبان ہے۔ ضروری یہ ہے کہ ہر صوبہ اپنا نصاب اپنی ضروریات کے مطابق وضع کرے۔ ہاں ہر صوبائی نصاب میں کچھ ایسے ابواب یا ایسی کتب شامل ہو سکتی ہیں جو قومی ہم آہنگی کو پروان چڑھائیں اس کی نشوونما کریں اس کو صلابت عطا کریں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم کے کئی نظام جاری و ساری ہیں۔ ایک مدرسوں کا نظام ہے، ایک گورنمنٹ کے اداروں کا نظام ہے اور ایک پرائیویٹ اداروں کا تدریسی نظام ہے، پرائیویٹ ادارے اپنا تدریسی نظام خود ترتیب دیتے ہیں۔ ایچی سن کا اپنا تدریسی نظام ہے اور بیکن سسٹم آف سکولز کا اپنا۔ اس طرح کچھ اور ملک گیر تعلیمی ادارے بھی ہیں یہ ممکن نہیں کہ آپ ہر طالب علم کو افلاطون بنا دیں، ارسطو بنا دیں، شیکسپیئر یا ملٹن بنا دیں، غالب یا اقبال بنا دیں۔ چلئے ہم نے تو ادباء اور شعراء کا نام لے لیا آپ کسی اور شعبے سے شخصیات کا ذکر کر سکتے ہیں، ہر شخص علم و فضل کا پیکر نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کو آپ انجینئر، ڈاکٹر، معلم نہیں بنا سکتے۔ اس لئے ایک نصاب ممکن ہی نہیں اور پھر ہر ادارے کا اپنا مزاج ہے، اس کی اپنی روایات ہیں، اپنا تدریسی نظام ہے اور سہولتوں کی نوعیت بھی الگ الگ ہے۔ طلباء بھی ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں کچھ تعلیم پر ہزاروں بھی خرچ نہیں کر سکتے اور کچھ لاکھوں کروڑوں خرچ کر دیتے ہیں۔ کچھ ایک پیسہ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتے اور کچھ علم پر سب کچھ تج دینا چاہتے ہیں اور بھلا آپ ایک قابلیت کے ادارے کیسے قائم کر سکتے ہیں، ایک جیسا نصاب کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ حکومتِ وقت اپنے اداروں میں ایسی سہولتیں طلباء کو فراہم کر دے کہ وہ بڑے سے بڑے پرائیویٹ ادارے کے برابر ہو سکیں ایسا ابھی ایک خواب ہے، ایک خیال ہے، ایسی خواہش تو کی جا سکتی ہے پر اس پر عمل ممکن نظر نہیں آتا۔ آپ دو فیصد کی بجائے ملکی کل آمدنی کا دس فیصد بھی خرچ کر دیں تو ایسا ممکن نہیں ہو گا، ابھی گورنمنٹ کے ایسے ادارے بھی ہیں جسے آپ سب جانتے ہیں، جن

میں نہ اساتذہ ہیں، نہ عمارت، بشمول فرنیچر، نہ لائبریری اور لیبارٹری کی بات ہی الگ ہے۔ یہ تو بڑے بڑے تعلیمی اداروں میں موجود نہیں اگر موجود ہوں بھی تو وہ نہ موجود کی طرح۔ تحقیق کا کام سرے سے نہیں ہے، محض طوطے کی طرح رٹنے کا نام کیا تعلیم ہے؟ سمیسٹر سسٹم نے تعلیم کے تابوت میں آخری کیل گاڑ دی ہے۔ MCQs نے تخلیقی صلاحیتوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے، بس اب تو حافظے کا کام ہے یا اندازہ ہے، اگر صحیح لگ جائے تو وارے نیارے ہیں، اگر صحیح نہ ہو تو پھر الزام قسمت پر۔

حضراتِ گرامی! میں یہاں ایک دعوتِ فکر دینا چاہ رہا ہوں تعلیم کے لئے تمام ذرائع اختیار کئے جانے چاہئیں، پہلی تو بات یہ ہے کہ ہم من حیث القوم تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کر لیں لیکن ہم ایسا کرنے کو تیار ہی نہیں، ہمارے نزدیک اہمیت دولت کی ہے، شہرت اور جاہ و منصب کی ہے شعور و آگہی کی نہیں اور جب تک ایسا ممکن نہیں ہو گا تو تعلیم کے میدان میں تمام کوششیں کار لاحاصل ہوں گی۔ یاد رہے کہ علم کی اہمیت سے انکار خود اپنے وجود سے انکار ہے، ہمارا تمام سماجی استحصالی نظام اس لئے قائم و دائم ہے کہ ہم تعلیم یافتہ نہیں، ہمارے ناخواندہ منفعت پرست جاہ و جلال کے بھوکے سیاست دان ہمارے سروں پر اس لئے سوار ہیں کہ ہم بطور قوم تعلیم یافتہ نہیں۔ ہم جانتے ہی نہیں کہ ہمارے کیا حقوق ہیں، کیا فرائض ہیں۔ شرطِ اول یہ ہے کہ ہم تعلیم کی اہمیت کو دل و دماغ سے قبول کر لیں اگرچہ موجودہ حالات میں یہ خواب حقیقت بنتا نظر نہیں آتا۔ ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ نظامِ تعلیم ایسا ہو کہ ہم اپنی زندگی کامیابی و کامرانی سے گزار سکیں، ہمارے ہاتھ میں ہنر ہو مگر ہمارا ذہن فکر سے عاری نہ ہو، ہم اچھے ڈاکٹر، اچھے انجینئر اور اچھے رضا کار پیدا کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان، اچھے مسلمان اور ایک اچھے پاکستانی بھی ہوں، ایک بات سب کو تسلیم کر لینی چاہیے اور یہ سب کے مفاد میں ہے کہ پاکستان کی تخلیق کے مقاصد کچھ بھی ہوں مگر پاکستان ہی ہماری پناہ گاہ ہے، پاکستان کی سلامتی اور مضبوطی ہی ہماری سلامتی اور مضبوطی ہے، یاد رکھئے کہ نصاب قومیں بناتی ہیں اور اگر کوئی افراد کا گروہ قوم نہ بنا ہو تو کوئی بھی تعلیمی نصاب

کارگر نہیں ہو سکتا۔ بہر کیف اذہان کا فرق ہمیشہ قائم رہے گا، ہمیشہ کچھ لوگ ذہین و فطین ہوں گے، کچھ کم ذہین ہوں گے، کچھ اوسط درجے کے ہوں گے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ سب کو ایک ہی طرح کا تعلیمی نصاب تھما دیں، ہاں کچھ مضامین ایسے ہو سکتے ہیں جو سب کے لئے ضروری ہیں وگرنہ تعلیم کا اصل مدعا کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ ہمیشہ لائق اور ذہین لوگ رہے ہیں لیکن ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، اب بھی ہم ہر ایک کو قائد اور اقبال نہیں بنا سکتے لیکن ایسا کرنے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں کہ بنیادی تعلیمی سہولتیں ہر ادارے میں موجود ہوں اچھے کتب خانے ہوں، اچھے تحقیق گھر ہوں اور بڑے لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ ہو، قرآنی اور اسلامی تعلیم سے طلبہ آراستہ و پیراستہ ہوں اور ان میں اعلیٰ اقدار کا احیاء ہو اور وہ تمام دنیا کو ایک گھر سمجھیں، مشرق و مغرب کا تفاوت نہ ہو، کالے گورے کا فرق مٹ جائے اور غریب و امیر کا خوفناک تفاوت نہ ہو، سب لوگ خدا کا ایک کنبہ بن کر رہیں یہی اسلامی نظریہ ہے اور یہی مثبت بین الاقوامی فکر ہے۔

☆☆☆

زبان کا مسئلہ

زبان کا مسئلہ دراصل اظہار وابلاغ کا مسئلہ ہے، جب زبان نہیں تھی تو غار کے دور کا انسان ہاتھ، منہ اور دیگر اعضاء کو ہلا کر گفتگو کیا کرتا تھا، یا تصویروں سے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس دور میں ضرورتیں بھی اتنی متنوع نہیں تھیں پیٹ بھرنا اور پتوں سے تن ڈھانپنا اور غاروں میں موسم کی شدت سے بچنے کی کوشش ہی روزمرہ زندگی کے لئے کافی سمجھی جاتی تھیں۔ ابھی اس کے دماغ میں افکار نے جنم نہیں لیا تھا، جذبوں میں شدت نہیں آئی تھی، احساس میں گہرائی موجود نہ تھی، کوئی تنوع اور بوقلمونی کا تصور نہ تھا۔ اگر کچھ تھا بھی تو وہ دبا رہ جاتا تھا، کہیں لاشعور میں کھو جاتا تھا۔ بہرحال جبلی سطح پر زندگی کٹ رہی تھی انسانوں اور جانوروں کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہ تھا لیکن آہستہ آہستہ انسان بہت سے مراحل سے گزرتا رہا، انسان نے اپنے جذبات وافکار کی آنکھ کھولی، یہ ارتقائی عمل تھا بھی قدرتی۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے، ضرورت آہستہ آہستہ ایجاد کے عمل سے گزرتی رہی، جب کچھ اور ضرورتیں پیدا ہوئیں تو انہیں پورا کرنے کے کچھ اسلوب تراشے گئے۔ پھر ضرورتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور اسی اثناء میں زبان وبیان کے مراحل بھی طے ہوتے رہے تا آنکہ لفظوں کے بیسیوں معنی تراش لئے گئے لفظ Denotative نہیں Connotative بن گئے یوں فنونِ لطیفہ نے بھی اپنا کردار ادا کیا، جب زبان بے بس نظر آنے لگی تو فنونِ لطیفہ نے جنم لیا۔ ویسے فنونِ لطیفہ کی پیدائش زبان کی پیدائش سے کہیں پہلے کی ہے، قدیم مصری تہذیب میں فنونِ لطیفہ کے بہت سے آثار بھی موجود ہیں، انسان اپنے خوف، خوشی اور غم کے اظہار کے لئے مختلف انداز سے فنونِ لطیفہ سے کام لینے لگا، یونانیوں اور رومیوں نے فنونِ لطیفہ میں بیش بہا ترقی کی اور زبان کے ساتھ ساتھ فنون کی اہمیت بھی بڑھتی چلی گئی۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن زبانوں کی ثروت ودولت کا انحصار اس کے بولنے والوں پر ہوتا ہے زبان تو محض اظہار کا ایک ذریعہ ہے لیکن اگر کہنے کے لئے کچھ کم ہو لکھنے کے لئے کچھ موجود نہ ہو تو پھر بات نہیں بنے گی اس میں کلام نہیں کہ انسانی جذبات واحساسات جغرافیائی حدود وقیود سے بالاتر ہیں، ایک انسان چاہے وہ کہیں بھی رہ رہا ہو اس کے احساسات کم وبیش ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر زبان کا ادب پڑھنا انتہائی ضروری سمجھتے ہیں اور اسے منفعت بخش قرار دیتے ہیں۔

جو ہومر نے لکھا، جو سوفوکلیز نے بیان کیا، جو شیکسپیئر نے اپنے جذب وشوق کی جولانیاں دکھائیں، جو کرشمے حافظ اور سعدی نے سرانجام دیئے جو زبان وبیان کے معجزے میر، غالب اور اقبال کے ہاں نظر آئے وہ اپنی جگہ اہم ہیں لیکن آج کا انسان بہت زیادہ معاشرتی ہو گیا ہے اور ترقی کی دوڑ میں بہت تیزی آ گئی ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی نے اپنا سکہ منوا لیا ہے اور اس نے انسانی زندگی کی جھولیاں بہت سی خوشیوں سے بھر دی ہیں جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی نے زندگی کو للکارا ہے وہاں یقیناً اسے سنبھالا بھی دیا ہے اس کی بقا کا اہتمام بھی کیا ہے اس کے تحفظ کو یقینی بھی بنایا ہے اور صحت کا میدان ہو یا علم ودانش کا، برقی آلات کی بات ہو یا دیگر مادی سہولیات کی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔

چنانچہ ہماری دنیا جذبات واحساسات کی دنیا کے ساتھ ساتھ مادی اور جسمانی ضروریات کی دنیا بھی ہے۔ آج ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ صحت مند رہے اس کے گھر میں سہولتیں ہوں، اس کا سفر آسانی سے گزرے، وہ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے وہ اپنوں کی حفاظت کر سکے وہ بیگانوں کی سازشوں سے محفوظ رہ سکے، زمینی اور آسمانی آفات سے نبرد آزما ہو سکے اور یہ ممکن اس وقت ہے جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے ہر نئی جو تبدیلیاں آ رہی ہیں اس سے واقفیت ہو۔ یہ بات تو واضح ہے کہ ہم ساری دنیا کا سفر نہیں کر سکتے لیکن دنیا کے تجربات سے ترقی وارتقاء سے واقفیت تو حاصل کر سکتے ہیں اس ضمن میں زبان کا مسئلہ بڑا نازک مسئلہ بن جاتا ہے ہم جنہیں اردو سے پیار

ہے، جو پنجابی سے محبت رکھتے ہیں، جنہیں اپنی علاقائی زبانیں پسند ہیں بعض اوقات ایک ماں کی طرح جذباتیت کا شکار ہو جاتے ہیں، جیسے اپنے بچے جیسے بھی ہوں سب سے زیادہ اچھے لگتے ہیں سب سے زیادہ لائق فائق ۔تعلیم یافتہ ماں، باشعور بہن، ذی علم باپ ان بچوں کی قدر کرتا ہے جنہوں نے ملک وقوم کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہوں ۔اسی طرح اپنی زبان سے ہمیں لاکھ محبت و پیار سہی ہمیں معروضیت اور غیر جانبداری کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ زبان کون سی ہے جسے ہم علم کا خزانہ کہتے ہیں۔جس میں ہر فن ہر علم اور ہر نوع کے تجربات صدیوں سے محفوظ ہیں، وہ زبان جو زمانے کے ساتھ ساتھ چلی ہے، وہ زبان۔جس نے زمانے کو تسخیر کیا ہے، وہ زبان۔جس کے بولنے والوں نے غار سے نکال کر چاند پر بٹھا دیا ہے، وہ زبان۔جس کے چاہنے والوں نے انسانیت کی ناقابلِ تصور خدمت سرانجام دی ہے اس کی کتنی اہمیت ہے، میرا اشارہ انگریزی زبان کی جانب ہے۔بذاتِ خود میں اپنی قومی اور علاقائی زبانوں کا بہت بڑا حامی ہوں اور میرے قارئین اس سے بخوبی واقف ہیں، میرا جذب وشوق اسی زبان میں ادا ہوا ہے جو میری اپنی ہے لیکن اس کا کیا کیجئے جو علم ودانش میرے پاس ہے وہ اتنا محدود ہے جس کے لئے مجھے انگریزی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے جو بدقسمتی سے میری اپنی زبان نہیں ۔تراجم کی بڑی اہمیت ہے لیکن تراجم پڑھتے وقت بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں اکثر وبیشتر اصل کھو کر رہ جاتا ہے اور اتنا بھونڈا ترجمہ ہوتا ہے کہ اس کو سمجھنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے اس ضمن میں نصابی کتب کا حوالہ دیا جا سکتا ہے ۔احباب نے بہت سی انگریزی کتب سے استفادہ کر کے طلبا کی آسانی کے لئے اردو میں کتابیں تحریر کر دی ہیں لیکن ترجمے کا عمل بہت دشوار عمل ہوتا ہے ۔اس میں وہ زبان۔جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اور وہ زبان۔جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے میں انتہائی قابلیت ، استعداد اور تخلیقی اپج کی ضرورت ہے، ترجمے سے ترجمہ نظر نہیں آنا چاہیے بلکہ ایسا لگے کہ یہی اصل ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ مترجم دونوں زبانوں سے کماحقہ بہرہ ور ہو اور ایسے افراد اور مترجم ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے، کچھ احباب نے یقیناً کامیاب تراجم کئے ہیں لیکن مسئلہ ایک یہ بھی

ہے کہ جب کوئی کتاب ترجمہ ہو کر سامنے آتی ہے اس وقت تک دنیا کا نقشہ تبدیل ہو جاتا ہے جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ ماضی کی بات بن جاتی ہے کیونکہ ترقی یافتہ اقوام تو ہر لحظہ نئے طور اور نئی برقِ تجلی کی تلاش میں ہیں وہ تو ہر لمحے نئے انکشافات کرنے والے لوگ ہیں، سائنسی جرائد پڑھ کر دیکھ لیجئے اندازہ ہوگا، کتنی تیزی سے ارتقاء کا عمل جاری ہے تو پھر ترجمہ کس حد تک اس تیز رفتاری کا ساتھ دے سکتا ہے آج کل کمپیوٹر کے ذریعے ترجمے بھی کئے جا رہے ہیں یہ تجربہ بھی کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ کمپیوٹر تو ایک پروگرامنگ کا مرہونِ منت ہوتا ہے جو ڈیٹا اسے مہیا کر دیا جاتا ہے وہ اس سے باہر نکل نہیں سکتا، میکانکی عمل کہاں اور تخلیقی عمل کہاں ؟اس لئے زبان کے معاملے میں تعصبات سے بلند ہونا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ کس زبان میں علم وحکمت کے خزانے ہیں کون سی زبان ہر پل کرشمے سرانجام دے رہی ہے، کاش کہ ایسا زبانِ اردو اور ہماری علاقائی زبانیں بھی کر سکیں لیکن زبانیں تو بولنے والوں کی رہینِ منت ہوتی ہیں اگر انہیں بولنے والے صدیوں پیچھے کے نظریات رکھتے ہوں اگر انہیں جوڑ توڑ سے فرصت نہ ملے اگر وہ اپنے گھر بھرنے میں زندگی صرف کر دیں، لوٹ کھسوٹ انکا وطیرہ بن جائے وہ اعلیٰ اقدار کا گلا گھونٹ لگیں اپنے ماضی کو فراموش کر دیں حال سے بیگانہ ہو جائیں اور مستقبل سے بے بہرہ تو پھر ان لوگوں کی زبانوں کا کیا قصور ہے، اردو کا کیا قصور ہے، علاقائی زبانوں کا کیا قصور ہے۔یقیناً چینی اپنی زبان کو اولیت دیتے ہیں لیکن چینی، چینی ہیں ۔جتنی ترقی اور محنت انہوں نے کی ہے کاش اردو بولنے والے بھی ایسا کر سکتے ۔جو ترقی جرمنی نے کی، اٹلی میں ہوئی ہے فرانس ، روس، برطانیہ اور امریکہ اور اس طرح کے بیسیوں ممالک میں ہوئی ہے کاش ایسا وطنِ عزیز میں بھی ہوتا اور پھر ہم اچھے لگتے اور پھر اردو زبان بھی دعائیں دیتی اور ہم اردو زبان کو گلے لگاتے ۔یقیناً یہ اب بھی ہمیں پیاری ہے اور پیاری رہے گی لیکن یہ پیار کہیں ہمیں ارتقاء کے منافع سے محروم نہ کر دے۔یہ پیار ہمیں ترقی یافتہ دنیا سے بے گانہ نہ بنا دے۔

یقیناً اگر ہم نے جینا سیکھ لیا زندگی گزارنا سیکھ لی، ہم انسان بن گئے تو پھر اردو کا جھنڈا بھی

بلند ہوگا، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو کا بھی ۔ہمیں دعا کرنی چاہیے اور اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے اور ساتھ ساتھ انسان بننے کی کوششیں بھی جاری رہنی چاہئیں اس جملے کے لئے پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔

☆☆☆

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

ایک تو دنیائے رنگ وبو وہ ہے جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہے، جس سے ہماری آنکھ لطف اندوز ہوتی ہے اور ہمارے کان حلاوت حاصل کرتے ہیں، جانے اس میں اللہ کی تخلیق کی ہوئی کیا کیا نعمتیں ہیں لیکن ایک دنیا وہ بھی ہے جسے اپنے قوتِ بازو سے تخلیق کرتے ہیں جسے ہم اپنی ہمت سے جلا بخشتے ہیں۔جس کا تاروپود ہماری تمناؤں اور آرزوؤں سے نشو ونما پاتا ہے، یہ وہ دنیا ہے۔جس میں ہماری شخصیت کے رنگ ہوتے ہیں۔جس میں ہماری روح کا سوزو ساز اور سرودِ ازلی موجود ہوتا ہے یہ وہ دنیا ہے جو ہمیں اعتماد عطا کرتی ہے عزت واحترام کا تاج ہمارے سر پر رکھتی ہے اور ہمیں احساس ہونے لگتا ہے کہ تخلیقِ کائنات میں کچھ حصہ ہمارا بھی ہے کچھ کردار ہم نے بھی ادا کیا ہے اقبال نے نپولین پر ایک نظم میں کچھ یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز   جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع   کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

یہ وہ جوشِ کردار ہے۔جس کی نظر میں کنجشک وحمام نہیں جچتے، جو جبریل اور سرافیل کو اپنا صید گردانتا ہے اور پھر اس صاحبِ کردار کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔یہ وہی کردار کی اُپج ہے جس نے غالب کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم   اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور ایک جگہ کہا

درد منتِ کشِ دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

گویا کردار کی صلابت کو درد تو منظور ہے دوا کا احسان منظور نہیں اور ایک جگہ اور غالب کہہ اٹھتا ہے

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

گویا کہ محبوب کے سامنے بھی کردار کی شمع روشن ہے، ہمت کے چراغ جل رہے ہیں، دراصل انفرادیت اسی کو کہتے ہیں، اور یہ انفرادیت اپنی دنیا آپ پیدا کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے، اقبال ایک جگہ کہتے ہیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راگ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم　　من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہی شخصیت کا جمال و کمال ہے یہی تخلیقی عمل ہے جانے کیوں جب ہمت حوصلے اور انفرادیت کی بات ہوتی ہے سب سے زیادہ شاعر مشرق علامہ اقبال یاد آتے ہیں۔

در شکن آں را نہ آید سازگار
با ضمیر تو دگر عالم بیاد
آں کہ او را قوت تخلیق نیست
پیش ما جز کافر و زندیق نیست

سبحان اللہ، اللہ نے اپنی اس مخلوق کو جسے آدم کہتے ہیں، اشرف المخلوقات بنا دیا، عظمت کا تاج عطا کیا، شہرت کے تخت پر جلوہ افروز کیا لیکن پھر کیا ہوا اور کیوں ہوا کہ ہم مسلمان، ہم پاکستانی، غالب و اقبال کو ماننے والے، ہر وقت کشکول توڑنے کی بات تو کرتے ہیں مگر توڑ نہیں پاتے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صرف کسی ایک فرد کا کام نہیں، کسی صدر یا وزیر اعظم کا کام نہیں بلکہ ا سکے لئے من حیث القوم یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم سر جھکا کر چلیں یا اٹھا کر چلیں۔ دینے والے ہیں یا لینے والے، کسی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے رہیں یا وقار اور توقیر کے ساتھ زندگی گزارنا سیکھیں۔ دراصل ہمارے اپنے بعض رویے بھی دریوزہ گری اور کاسہ لیسی کو جنم دیتے ہیں۔ خدا نے تو چاہا تھا کہ صرف سجدہ میرے لئے روا ہے لیکن ہم نے جانے کس کس کے کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ایک خدا کی بجائے جانے کتنے خدا تراش لیے۔ نبی اکرمؐ نے تو بتوں کو توڑا تھا لیکن

ان کے ماننے والوں نے پھر بتوں کی پوجا شروع کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ اقوامِ عالم میں ہم سر اٹھا کر نہیں چل سکتے ہمارا تمام اسلوبِ حیات قوت و طاقت کے دیوتا تراشتا ہے اور ہم منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں، خود ہمارے وطن عزیز میں ایسی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں جو گداگری کو ہوا دیتی ہیں ہماری رائے میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے عوام کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے، بچوں اور بوڑھوں کو وظائف دے اور بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرے، یہ صورتحال انتہائی حوصلہ افزا ہوگی، اس کے مقابلے میں دستر خوان لگا دینا اور لنگر کھول دینا گداگری کو جواز فراہم کرنا ہے۔ یہ درست ہے کہ موجودہ حالات میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو نانِ شبینہ کو ترستے ہیں، جن کے لئے دو وقت کا کھانا کسی آزمائش و ابتلاء سے کم نہیں لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ ان کی انا ان سے چھین لی جائے، ان کی خودی کا خون کر دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کی طرح انہیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنا پیٹ بھر سکیں، اپنا تن ڈھانپ سکیں، سر چھپانے کے لئے ان کے پاس گھر ہو اور پھر وہ اعتماد اور بھروسے کے ساتھ قومی تعمیر کے کاموں میں منہمک ہو سکیں ا سکے لئے ہمیں من حیث القوم سوچنا ہوگا، ہر ایک کو سوچنا ہوگا اور اپنا کردار ادا کرنا ہوگا ورنہ اقبال اور غالب کو پڑھنے سے کچھ نہیں بنے گا، آزادی کے نعرے بے سود ہوں گے، سب قہقہے کھوکھلے ہوں گے اور زندگی موت کی آغوش میں سسکتی اور تڑپتی رہ جائے گی۔

☆☆☆

صید بھی ہم، صیاد بھی ہم

انتہائی مضحکہ خیز صورتحال ہے، اس کرۂ ارض کے باسیوں کی جس پر وہ عرصہ ہائے دراز سے قیام پذیر ہیں اور جو کچھ نعمتیں اللہ نے انہیں دی ہیں اس کا شمار ہی مشکل ہے۔ قدرت نے کچھ ایسا نظام ترتیب دیا ہے کہ انسان خوش و خرم زندگی گزارنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال سکتا ہے۔ مانا کہ فطرت بسا اوقات بڑی سفاک محسوس ہوتی ہے۔ یہ زلزلے، طوفان بارشیں، چلچلاتی دھوپ منجمد کر دینے والی ہوائیں اور اس طرح کی بہت سی فطرت کی دست اندازیاں ہمارے لئے اس قدر مشکلات پیدا کر دیتی ہیں اور ہمارے لئے یہ امر دشوار ہو جاتا ہے کہ ہم ورڈزورتھ کے ساتھ متفق ہوں اور کہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ جو ٹھیک نہیں ہے اسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ جاپانی زلزلوں کی زد میں تھے انہوں نے ایسے گھر بنانا شروع کر دیئے جنہیں زلزلے متاثر نہیں کر سکتے تھے، اس طرح بہت سے ایسے ممالک ہیں جہاں سیلاب طوفان اور بارشیں اگر ضرب کاری لگانا بھی چاہیں تو لگا نہیں سکتیں لمحوں میں نقصان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ ایسے ممالک اور ایسی اقوام بھی ہیں جنہوں نے مہلک بیماریوں کو قابلِ علاج بنا دیا ہے اور اس طرح انسان کی زندگی کو خوشیوں سے لبریز کر دیا ہے۔ اس کے باوجود کرۂ ارض پر اشخاص کی اتنی بڑی تعداد ہے جو زندگی کے درپے ہے بلکہ اپنے درپے ہے، خود اپنی قبر کھودتی ہے، خود اپنی زندگی سے کھیلتی ہے ہمیں معلوم ہے کہ افریقہ کے لوگ خود اپنے ہی ساتھیوں کو اپنے پیٹ کی بھوک بجھانے کے لئے شکار کرتے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ کچھ پرندے اور درندے اپنی ہی اولاد کو لقمہ تر بنا لیتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اپنے بزرگوں کی زندگی سے کھیلتے ہیں لیکن یہ سب کچھ تو اس وقت کی بات ہے جب تہذیب اور شائستگی نے قدم نہیں جمائے تھے۔

اب جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ نے ہمیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے، ہماری

زمین کے پاس اتنے ذرائع ہیں کہ صدیوں ختم نہیں ہو سکتے بلکہ تا قیامِ قیامت موجود رہیں گے، پھر ایسا کیوں ہے کہ ہم نے خود اپنی خود غرضیوں کے باعث اپنے ساتھیوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب کسی پر عرصہ حیات تنگ ہوتا ہے تو عرصہ حیات تنگ کرنے والا خود بھی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ آج وہ لوگ جنہوں نے اپنی تجوریاں بھر رکھی ہیں، جن کے پاس محل نما مکان ہیں، جو ہزاروں مربع زمین پر قابض ہیں اور دنیا کی ہر نعمت سے فیض یاب ہیں لیکن پھر بھی یہ سب کچھ کر کے وہ اپنی تباہی اور بربادی کا سامان مہیا کر رہے ہوتے ہیں۔ انہیں ہر لحہ کچھ کھو جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے ان کے چاروں طرف سازشوں کے جال بنے ہوتے ہیں۔ کبھی اولاد انہیں تہہ تیغ کر دیتی ہے اور کبھی وہ اپنی اولاد کی زندگی سے کھیلنے لگتے ہیں، ایک ایسی کشمکش جاری رہتی ہے جس میں تمام دولت، تمام ثروت، تمام آسائشیں اور نعمتیں بے لذت اور بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم خود ہی شکاری ہیں اور خود ہی اپنا شکار کرتے ہیں۔ بڑی اقوام نے چھوٹی اقوام پر حکمرانی کرنے کی کوشش کی، ان کی زندگی کے اسلوب کو تہہ و بالا کر دیا اور نتیجتاً اب ایسی دہشت گردی نے جنم لیا ہے جس سے یہ غالب اقوام بھی محفوظ و مامون نہیں، گویا جو خود انہوں نے کاشت کیا ہے اب اسی کی فصل وہ کاٹ رہے ہیں۔ یہ بات اب تک ہم سب کو معلوم ہو جانی چاہیے کہ ہم زندگی پر مظالم ڈھا کر انسانوں کی زندگیوں سے کھیل کر، ان کے حقوق کو سلب کر کے، ان کی راتوں کی نیند سے انہیں محروم کر کے، انہیں اپنے ٹکڑے کھانے پر مجبور کر کے کبھی پُرسکون زندگی نہیں گزار سکتے، وہ جنہوں نے ایسا کیا وہ کیا ہوئے، خود وطنِ عزیز میں بڑی طاقت ور اور رعنا شخصیات جلوہ گر ہوئیں، انہیں یہ لگتا تھا کہ ان کے سامنے کوئی پَر بھی نہیں ہلا سکتا لیکن پھر تاریخ نے دیکھا، کیا دیکھا وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اتحاد و اتفاق سے انسانیت کو ایک خاندان تصور کر کے اس خوبصورت کرے پر اتفاق و اشتراک سے جینا سیکھ لیں تو ہمیں فطرت کی فیاضیاں نظر آئیں گی اور جہاں فطرت خوں آشام ہو گی وہاں اس کا تدارک کرنا

دشوار نہ ہوگا، سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو ترقی کی ہے ایک اعتبار سے وہ مستحسن ہے لیکن ہمارے استحصالی نظام نے پوری انسانیت کو اس سے فیض یاب ہونے کا ہر موقع چھیننے کی کوشش کی ہے بھلا سوچیئے کہ وہ انسان جو محلات میں رہتے ہیں اور وہ انسان جو ایک چھوٹے سے کمرے میں آٹھ آٹھ دس دس نفوس کی صورت میں رہتے ہیں ان کا کیا حال ہوگا ،اگر یہی مساوی تقسیم ہو جائے اور ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ سمجھنے لگیں کہ اگر ہمارا پڑوسی بھوکا مر گیا تو ہماری کبھی نجات ممکن نہیں ہوگی تو ہم زندگی کے دستیاب ذرائع سے کس قدر مستفید ہو سکتے ہیں اور سب ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی بے بسی کے جواز کے لئے بھی بت تراش لئے ہیں جن میں ایک قسمت کا بت ہے، ثروت مند اس بت کے تراشے جانے پر بغلیں بجاتے ہیں کیونکہ ان کے پاس سب کچھ ہے اور جو نانِ شبینہ کو ترستے ہیں وہ ترستے رہ جاتے ہیں اور اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لیتے ہیں کہ ان کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ ایک زندگی بھر داد عیش دے اور دوسرا ایڑیاں رگڑ رگڑ کے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دے۔ جب ہم عدل وانصاف کرتے ہیں تو یار لوگ اسے اشتراکیت سے منسوب کر دیتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کیا ہیں، صحابہ کرام اپنے پاس اتنا نان ونفقہ رکھتے تھے جو انہیں ایک دن کے لئے کافی ہو جاتا باقی سب ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ایسے میں کبھی کبھی انہیں خود بھی بھوکا رہنا پڑتا تھا۔

ہماری رائے یہ ہے کہ ہم اپنی تمام مشکلات کے خود ذمہ دار ہیں جو طاقت ور ہے وہ نشے میں چُور رہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ زندگی کی تمام نعمتوں پر قابض ہو جائیں۔ جو مفلوک الحال ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی غربت وعسرت ان کی آزمائش کے لئے ہے اور اس آزمائش کے بدلے ان کی بخشش ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب اسلام کی روح سے اور تہذیب وشائستگی کے تمام اسالیب کے مطابق کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ زندگی کے بنیادی ذریعوں پر قابض ہو جائے ، ارب پتی اور کھرب

پتی بن بیٹھے، رات ہی رات میں اس کی کوٹھیاں تیار ہو جائیں، قانون ان کے گھر کی باندی بن جائے ،عدل ان کے سامنے سسکتا ہوا دکھائی دے۔ اس سب صورتحال کے جس طرح اصحاب ثروت ذمہ دار ہیں ،اسی طرح غربت زدہ طبقہ بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ذمہ داری ان لوگوں پر زیادہ عائد ہوتی ہے جو حقیقت سے آشنا ہیں، جو مذہب کی روح کو سمجھتے ہیں، جو انصاف کے تقاضوں سے واقف ہیں جنہیں عظیم شخصیت کے اسلوبِ حیات کا علم ہے، جنہیں معلوم ہے کہ اللہ کی دھرتی سب کے لئے ہے، اللہ کی ہوائیں فضائیں گھٹائیں سب کے لئے اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہیں لیکن ہم نے تو موسموں کو بھی صرف اپنے لئے باندی بنا لیا، دولت مند کو طوفان اور سیلاب کا کوئی خطرہ نہیں، ان کے محلات زمیں بوس نہیں ہوتے ، ان کی کوٹھیاں زلزلے سے مامون رہتی ہیں، بقول شاعر

ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فرازؔ
کچا تیرا مکان ہے کچھ تو خیال کر

یقیناً بارشوں سے دوستی فرازؔ کے لئے اچھی نہیں تھی یا ان کے لئے اچھی نہیں تھی جو اس شعر کی تخلیق میں اس کی نظر میں تھے لیکن بارشوں سے دوستی نبھانے کا موقع ان کے ہاتھ لگتا ہے جن کے پاس زندگی کی تمام آسائشیں موجود ہوتی ہیں اور جنہیں لحظہ بھر بھی اس اذیت سے گزرنا نہیں پڑتا اس سے وہ لوگ گزرتے ہیں جو اس کی وجہ سے مجبور ہیں۔ بقول فیض

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر بپا کیوں نہیں کرتے

یقیناً اللہ منصف ہے اور اس نے ہر انسان کو اتنی صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ انصاف سے کام لے اور برے بھلے کی تمیز کرے اور یہی اس کا انصاف ہے اور جب اس انصاف سے رُوگردانی کی جائے گی تو زندگی از خود انتقام لینے پر مجبور ہو جائے گی۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ جو لوگ بظاہر آسودہ ہیں دراصل ان کی آسودگی بھی کسی طور ان کی روح کو تسکین نہیں دے سکتی۔ کہیں

کہیں انہیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ انکے محلات بے کس لوگوں کی قبروں پر تعمیر ہوئے ہیں، بس اس حقیقت کو جاننے کی ضرورت ہے کہ ہماری معاشرتی اور معاشی بدحالی کے ذمہ دار ہم خود ہیں ،کوئی آسمانی طاقت ایسی نہیں جو یہ چاہے کہ اس طرح ظلم واستبداد روا رکھا جائے۔ زمین بھی فیاض ہے جانے کیا کیا عطا کرتی ہے لیکن ہم اسے اپنی اجارہ داری بنا لیتے ہیں، اس پر قابض ہو جاتے ہیں، جور و ظلم کی بنیاد پر اور طاقت اور قوت کی بنیاد پر۔ یہ سچ ہے کہ

صید بھی ہم صیاد بھی ہم

☆☆☆

قیامتِ صغریٰ

ہم سب کے ذہنوں میں قیامت کا ایک انتہائی ہولناک تصور ہے اس کا نام آتے ہی ہر صاحبِ ایمان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کتنا مشکل ہوگا وہ دن، کتنے طویل ہوں گے وہ لمحات، کتنی کڑی ہوگی وہ آزمائش اور کتنا جان لیوا ہوگا وہ منظر، جب پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے۔ ہر چیز تہس نہس ہو کر رہ جائے گی اور ہر شخص بے تاب اور بےقرار ہوگا۔ لیکن اس سب کے باوجود اہلِ ایمان کے ذہن میں یہ حقیقت بھی ہمیشہ موجود رہتی ہے کہ اللہ غفورالرحیم ہے، جانے اسے ہمارا کون سا عمل اچھا لگ جائے۔ لیکن جس قیامت سے ہم آج دوچار ہیں وہ انتہائی حوصلہ شکن اور روح فرسا ہے۔ قیامتِ کبریٰ میں تو جزا وسزا کا انحصار ہمارے اعمال پر ہوگا مگر جو قیامت صغریٰ اب برپا ہے اس میں بڑی حد تک اعمال کا کوئی تعلق نہیں۔ سوچیئے وہ معصوم بچے، وہ بھولے بھالے طالب علم جو حصولِ علم کے لئے اپنی درس گاہوں کو جاتے ہیں ان کا کیا قصور ہے کہ انہیں لمحوں میں تہہ تیغ کر دیا جائے ،ان کا کیا قصور ہے جو اپنی حاجات پورا کرنے کے لئے بازاروں میں جاتے ہیں اور وہیں انسانی ہاتھوں سے ان کا خون ہو جاتا ہے، کوئی نماز پڑھ رہا ہے ،کوئی کاروبار میں معروف ہے، کوئی اپنے کسی کام کے لئے جا رہا ہے، کوئی ہسپتال میں ہے، کوئی اپنے گھر میں بیٹھا ہے اور دھماکہ ہوا سب کچھ ملیا میٹ ہو گیا۔ کیا انسانی خون اتنا ارزاں ہو گیا ہے، کیا انسان اتنا بے وقعت ہے کہ اس کی چیونٹی کے برابر بھی اہمیت نہیں۔ جو دہشت گردی آج ہو رہی ہے وہ اپنی جگہ، اور بھی جانے کتنی تخریبی کاروائیاں، کتنے ڈاکے، کتنی چوریاں، کتنا کشت و خون ہر لمحہ دیکھنے میں آتا ہے اور ہم حیران ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کیا یہ وہی انسان ہیں جن کے لئے نبی آخرالزماںؐ نے کعبہ کا طواف کرتے ہوئے کہا تھا اے کعبہ تو بہت محترم ہے بہت عظیم ہے لیکن ایک انسان کا خون تجھ سے بھی زیادہ محترم اور قابلِ تکریم ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ایک انسان کا

قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔قتل کی ایک صورت تو ہم سب کو معلوم ہے اور ہم اس کے بارے میں پریشان بھی ہیں لیکن اس قتل کے بارے میں کیا کہئے گا جس کا مشاہدہ ہم روزانہ کرتے ہیں یعنی ناخالص خوراک، دونمبر ادویات، ہر چیز میں ملاوٹ، دن دیہاڑے دھوکا، ہر لحہ فریب۔یہ صورت حال کتنی افسوسناک ہے۔دہشت گردی کا عمل حال میں بہت تیز ہوا ہے۔مگر جو خون کی نہریں بیس تیس سالوں سے کراچی میں بہتی رہی ہیں اس کے بارے میں کیا کہیئے گا اور پھر جو ایک بے رخی، بے اعتنائی اور بے پروائی کی لہر ہمارے ہر گلی محلے میں موجود ہے اس پر سوچیئے تو سوچتے چلے جایئے۔کسی کو یہ خبر نہیں کہ اس کے پڑوسی کی کیا حالت ہے، اس پر کیا گزر رہی ہے اور اس کے پاس نانِ شبینہ ہے بھی یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے عبادات کا اہتمام اس لئے بھی کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کر سکیں، لیکن وہ تو سب ختم ہو کر رہ گیا ہے۔جو احباب پنجگانہ نماز مسجد میں پڑھنے جاتے ہیں ان کا انداز بھی میکانکی ہو کر رہ گیا ہے، عین وقت پر مسجد گئے اور پھر فی الفور واپس دوڑنے کی کوشش کی، کسی کے پاس اگر کوئی وقت ہے تو اتنا کہ وہ رسماً کسی سے پوچھ لے کہ آپ کیسے ہیں اور دوسرا رسماً جواب دے دے، ٹھیک ہوں اللہ کا شکر ہے ، نہ پوچھنے والے نے خلوص سے پوچھا نہ بتانے والے نے دل کی کہی۔عید کا اہتمام وسیع پیمانے پر اس لئے کیا جاتا ہے کہ بستی کے سب لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوں اور ایک دوسرے سے مل لیں لیکن عید کے اس اجتماع کی حالت بھی دیدنی ہوتی ہے، کوئی کسی سے گلے ملتا ہے تو محض رسماً۔ایک شخص تیس چالیس یا پچاس لوگوں سے گلے ملتا ہے لیکن گلے ملنے میں نہ کوئی قربت کا احساس ہے نہ اخلاص کی مہک۔نہ کسی کی حالتِ زار جاننے کی خواہش اور نہ کسی کی مشکلات بانٹنے کا احساس۔ہم سب تمام عبادات بھی ایک روبوٹ کی طرح سر انجام دینے لگے ہیں کیا یہی قیامتِ صغریٰ نہیں اور شاید کبریٰ بھی کہ جہاں ہر کسی کو اپنی اور صرف اپنی پڑی ہے نہ کسی کو یہ خبر ہے کہ اس کے باپ پر کیا بیت رہی ہے اور نہ باپ کو یہ علم ہے کہ اس کے بچے کیا کر رہے ہیں، اللہ اللہ یہ شانِ بے نیازی اللہ اللہ! یہ خودغرضی اور بے اعتنائی، بے حسی سفاکی کیا یہی قیامت صغریٰ نہیں۔گوشت پوست کا انسان

پتھر بن کر رہ گیا ہے بس میکانکی طور پر ہنستا ہے۔اب ایک دن میں کسی ایک موت کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ سینکڑوں اموات کا ذکر ہوتا ہے اب قتل و غارت روز کا معمول بن گئی ہے بس عادات کا گورکھ دھندہ ہے، سو جان سے گئے دو سو مارے گئے، اتنوں کی عزت لٹی، اتنوں کے گھر برباد ہوئے، کسی کو خبر نہیں۔یہ وادی انسانوں کی وادی محسوس نہیں ہوتی ، اس بستی میں انسان نہیں اینٹیں اور پتھر آباد ہیں اور اس پر مستزاد کہ ذہن کو سکون و قرار نہیں ، کروڑوں جمع ہو جائیں یا اربوں، ہوس کا عفریت مطمئن نہیں ہوتا، یہ بے اعتنائی یہ بے پرواہی، یہ اضطراب سب کچھ ثابت کرتا ہے کہ ہم ایک انتہائی دورِ ابتلا و آزمائش سے گزر رہے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد کا جانکاہ واقعہ ہوا لیکن پھر مسلمان سنبھل گئے پھر ملک آباد ہو گئے۔اب بھی اگر ہم میں سے محض مٹھی بھر کو ہی سہی اس نازک صورتحال کا ادراک ہو جائے اور ہم جو سوچتے ہیں وہ مثبت انداز سے سوچنے لگیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں یہ دوڑ دھوپ یہ ہماہمی یہ تیزی و طراری ایک شیطانی عمل ہے اور اس سے ہم میں سے کسی کو فائدہ نہیں ہونے والا اس طرح ہماری مشکلات بڑھتی رہیں گی اور ہم دوڑتی بھاگتی لاشیں بن کر رہ جائیں گے جن کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے نہ مستقبل۔اگر سوچ مثبت راہیں اختیار کر لے تو اللہ کی رحمت نازل ہو سکتی ہے اور پھر اچھے دن آ سکتے ہیں کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ لا تقنطو من رحمة الله

☆☆☆

حصولِ تعلیم ایک چیلنج

یوں تو حصولِ تعلیم کی راہ میں ہمیشہ مشکلات حائل رہی ہیں بلکہ تعلیم کا مفہوم ہی بہت سے مغالطے کا شکار رہا ہے۔ایک طبقے نے تو صرف دینی تعلیم ہی کو تعلیم گردانا لیکن پھر اسلامی زعما نے ثابت کیا کہ تعلیم تو علم کے حصول کو کہتے ہیں، خواہ وہ دین کا ہو یا سائنس اور ٹیکنالوجی کا، فلسفے اور تاریخ کا ہو یا کسی اور شعبۂ زندگی کے بارے میں ہو، بھلا ہو سرسید احمد خان کا کہ انہوں نے مسلمانانِ برصغیر کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی بے پناہ کوششیں کیں جو رنگ بھی لائیں۔اگرچہ ان کی بے پناہ مخالفت ہوئی لیکن انہوں نے اپنے مشن کو جاری رکھا اور پھر ان کی مساعی کے نتیجے میں مسلمانوں کے دلوں میں شعور و آگہی کے چراغ روشن ہوئے۔انہیں اپنی راہ نظر آنے لگی انہیں ملی تشخص کا احساس ہوا اور پھر مسلمانانِ برصغیر نے وہ معجزہ سرانجام دیا جس کی تاریخِ عالم میں کوئی مثال نہیں ملتی یعنی یہ کہ مملکتِ خداداد پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھری۔اس تمام تر پس منظر کے باوجود عزیزانِ وطن اس حقیقت کو بھولتے رہے کہ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جو وطنِ عزیز کو باعزت قوموں کی صف میں کھڑا کر سکتا ہے۔تعلیم کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر رہی وقت کے ساتھ ساتھ اچھی حکمرانی باقی نہ رہ سکی اور جہاں ساری حکومتی مشینری زنگ آلود ہوئی وہاں تعلیمی اداروں کی حالت بھی بد سے بدتر ہوتی چلی گئی، پھر تعلیم کو ایک کاروبار بنا لیا گیا ایسا کاروبار جس میں متوسط طبقہ بھی تعلیم سے محروم رہنے لگا، تعلیمی اخراجات بڑھنے لگے یہ ٹھیک ہے کہ جدھر دیکھئے آپ کو تعلیمی ادارے نظر آئیں گے لیکن ان تک عام آدمی کی رسائی ممکن ہی نہیں، فیسیں ہوشربا ہیں اور کتابیں اتنی بیش قیمت ہیں کہ جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔چنانچہ ۸۰ فیصد طلبہ و طالبات پر حصولِ تعلیم کے دروازے بند ہو گئے اور جو کچھ گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں صورتِ حال ہے اس سے کون ہے جو واقف نہیں، بڑے تعلیمی ادارے پرائیونائز کر دیئے گئے جن کا مقصد حصولِ دولت

محسوس ہوتا ہے وہ بھاری فیسیں حاصل کرتے ہیں اور بے مصرف ڈگریاں ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں، ان ڈگریوں کا ذہنی استعداد سے دُور کا بھی تعلق نہیں اور پھر طلبہ اور طالبات ڈگریاں ہاتھوں میں تھامے پریشان حال دکھائی دیتے ہیں۔یونیورسٹیز میں سمسٹر سسٹم نے تو صورتِ حال کو بالکل مخدوش کر کے رکھ دیا ہے۔اساتذہ جو کچھ پڑھاتے ہیں اس کا امتحان بھی وہ خود ہی لے لیتے ہیں، اب انہیں اس کی کوئی فکر نہیں کہ ان کے نتائج پر کسی کی نظر ہے بھی یا نہیں وہ چاہیں تو سو میں سے سو نمبر دے دیں یہ سب ممتحن کی صوابدید ہے۔سوچیئے پاکستانی پس منظر میں ایسا کہاں ممکن ہے جہاں دولت صرف چند ہاتھوں میں موجود ہے اور جہاں طاقت کے ذریعے زندگی کے امور چلائے جاتے ہیں۔ایسی صورت میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ کوئی اُٹھے اور سرسید کے نقشِ قدم پر چلے اور پھر ایسے ادارے قائم ہوں جہاں تعلیم تجارت نہ ہو بلکہ عبادت تصور ہو، جہاں یہ لگے کہ حصولِ تعلیم بقائے حیات کا واحد ذریعہ ہے یا لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ بدلتے ہوئے اور بہت تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس دور میں تعلیم سے پیچھے رہ جانے والی اقوام ہر میدان میں بازی ہار جائیں گی کچھ صاحبانِ نظر اور صاحبانِ دل یہ تہیہ کریں کہ وہ تعلیم کو کاروبار نہیں بنائیں گے بلکہ اسے ملی اور قومی فلاح و بہبود کا ذریعہ تصور کریں گے۔اس ضمن میں ایک حقیری کوشش کا بیڑہ میں نے اور میرے چند احباب نے اٹھایا ہے ہم ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس کا مقصد زر اندوزی نہ ہو بلکہ مستحق بچوں کو ان کی استعداد کے مطابق آگے بڑھنے کا موقع ملے۔وہ ایک آزاد فضا میں سانس لے سکیں، وہ علم کو علم کی خاطر حاصل کریں انکی تخلیقی استعداد میں اضافہ ہو، وہ خود سوچ سکیں، خود لکھ سکیں، اپنے جذبات کا اظہار کر سکیں، ان میں خود اعتمادی پیدا ہو، وہ احساسِ کمتری سے نجات پائیں اور پھر وطنِ عزیز کو وہ عظمتیں عطا کریں جن کا خواب اقبال اور قائداعظم نے دیکھا تھا اس سلسلے میں کوششوں کا آغاز کر دیا گیا ہے، ایک ادارہ ویلفیئر ایجوکیشن سنٹر کے نام سے شروع کیا جا رہا ہے اس میں آپ کے تعاون کی بے حد ضرورت ہے، میں اور میرے احباب کوئی نصف صدی سے بے بصر بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کوشاں ہیں اور کوشاں رہیں گے،

ہمیں اپنی کاوشوں میں بہت سی کامیابیاں بھی ہوئی ہیں سینکڑوں نابینا بچے باعزت زندگی گزارنے کے قابل ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ اپنے اعزا و اقربا کی کفالت بھی کرتے ہیں، وہ اچھے عہدوں پر فائز ہیں اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں اسی طرح ہماری خواہش ہے کہ عام بچے بھی جن کا بھرپور استحصال ہو رہا ہے زیورِ علم و ہنر سے آراستہ ہوسکیں اس ضمن میں آپ کا تعاون انتہائی ضروری ہے، آپ اپنے عطیات ویلفیئر ایجوکیشن سنٹر کے نام پر ۱۳۱۔ رحمت پارک یونیورسٹی روڈ سرگودہا پر ارسال کریں تا کہ میں اور میرے احباب اس نئے جہاد میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔ کام مشکل ہے لیکن خلوصِ نیت اور مسلسل محنت سے مشکل کام بھی آسان ہو سکتے ہیں۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ بود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

☆☆☆

ہم ہنوز پتھر کے دَور میں سانس لے رہے ہیں

یہ تھا بزمِ فکروخیال کے 175ویں اجلاس میں گفتگو کا موضوع، ہم ایسے موضوعات پر بزم کی تاسیس سے احباب کو دعوتِ فکر دیتے رہے ہیں۔ ان میں بعض موضوعات ایسے بھی رہے ہیں جن پر گفتگو کرنا خاصا دشوار تھا بلکہ بعض حالات میں گردن زدنی ہو سکتا تھا لیکن بزم کی محفلوں میں بحمد اللہ نازک سے نازک موضوع پر احباب نے اپنے افکار کا اظہار کیا، کھل کر اپنی رائے دی اور پھر میں نے تمام گفتگو کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ کسی نتیجے پر تو نہیں پہنچتے رہے اور کسی نتیجے پر پہنچنا ہمارا مطمعِ نظر بھی نہیں ہوتا کیونکہ ایسا ممکن ہی نہیں۔ اختلافِ رائے معاشرتی رویوں کا حسن ہے۔ بس یہ کوشش کی جانی چاہیے کہ ہم اپنی دیانتدارانہ رائے پیش کر دیں اور دوسروں کی آراء کو خوش دلی سے سنیں اور سنتے چلے جائیں۔ والٹیئر فرانس کے عظیم دانشور نے کہا تھا کہ بے شک مجھے اُس کی رائے سے اتفاق نہیں لیکن میں اس کی رائے کے تحفظ کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ کیا خوبصورت بات کہی تھی اس دانشور نے۔

ہماری کوشش بھی یہی رہتی ہے کہ ایسے موضوعات زیرِ بحث لائے جائیں جن سے ذہنی انجماد ختم ہو اور نئے نظریات و افکار تشکیل پاتے رہیں۔ زیرِ نظر موضوع پر احباب نے کھل کر روشنی ڈالی، کچھ احباب نے موضوع سے اتفاق نہیں کیا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ نعمتوں کا ذکر کیا اور کہا کتنا آرام میسر ہے ہمیں، لمحوں میں جہاں چاہیں پل بھر میں پہنچ جایئے، جس سے چاہیں گفتگو کر لیجئے، دنیا ایک عالمی گاؤں بن گیا ہے، کیا یہ پتھر کا دور ہے؟ لیکن کچھ احباب نے موضوع سے اتفاق کیا ان کا خیال تھا کہ سہولتوں سے صرف مادی فوائد حاصل ہوئے ہیں انسانی اور جذباتی نہیں۔ انسان ایک دوسرے سے کوسوں دُور ہے، ایک انسان کا دوسرے انسان سے ملنا محال ہے، باپ بیٹے سے گفتگو کرنے کو ترستا ہے اور بیٹا زندگی کی دوڑ دھوپ میں ہر وقت اس قدر مصروف

ہے کہ اس کے پاس اپنی ذات سے بھی گفتگو کرنے کا کوئی موقع میسر نہیں، صبح ہوتے ہی باپ ماں اور بچے اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں کٹھ پتلیوں کی طرح حاجات کے ہاتھوں میں رقص کرتے ہیں اور محظوظ ہونے والے بھی کٹھ پتلیوں کی طرح حظ اٹھاتے ہیں، سب کچھ کٹھ پتلیوں کا تماشا ہے۔کوئی کٹھ پتلی ناچتی ہے تو کوئی نچاتی ہے۔ایک بے ہنگم رقص ہے،ایک بے مقصد تگ و تاز ہے،ایک خونی ڈرامہ ہے، بے حسی کی تمثیل ہے اور یہ سب کچھ ترقی کے نام پر فلاح کے نام پر اور کامیابی کے نام پر کیا جا رہا ہے،ایک خوفناک بات اور بھی ہے جو ہمیں پتھر کے دور سے بھی پیچھے لے جائے گی جب ہم دیکھیں گے کہ کل پرزے کہ انسان اشرف المخلوقات کی جگہ لے رہے ہوں گے اور اسے پچھاڑ رہے ہوں گے، یہ وہ روبوٹ ہوں گے جو انسان کی کائنات میں ایک زلزلہ بپا کر دیں گے اور یہ دن دُور نہیں لیکن جو روبوٹ نہیں ہیں وہ بھی روبوٹ ہیں، ہم سبھی روبوٹ ہیں ، سبھی پتھر ہیں، سلیں ہیں، چٹانیں ہیں جن میں زندگی کے آثار ختم ہوتے جا رہے ہیں۔اگر یقین نہ آئے تو اپنے ہسپتالوں، تعلیمی اداروں، مارکیٹوں اور گھروں کا مشاہدہ کر لیجئے ، یہ ٹھیک ہے کہ کچھ کے پاس بہت کچھ ہے اور کچھ کے پاس کچھ بھی نہیں، جن کے پاس کچھ نہیں وہ کچھ بھی نہیں، جن کے پاس کچھ ہے وہ سب کچھ ہیں لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک روبوٹ ہیں۔ایک کٹھ پتلی ہیں۔تعصبات کے ہاتھوں میں، جھوٹے حقائق کے ہاتھوں میں، عصبیت کے ہاتھوں میں، احساسِ برتری کے شکنجوں میں، احساسِ کمتری کی دوزخ میں بھوک کے چنگل میں، بے کاری کی دہشت میں۔

یہ وہ پتھر کا دور ہے جہاں پتھر بے حرکت نہیں ہوتے بلکہ ہر پتھر دوسرے پتھر سے جا ٹکراتا ہے اور دونوں چور چور ہو جاتے ہیں، ایک پتھر مغرب ہے اور دوسرا مشرق دونوں پتھر ہیں اور کچھ نہیں، ایک پتھر علم کا پتھر جس نے دوسروں پر برسنا سیکھا ہے، ایک جہالت کا پتھر ہے جسے کچھ سمجھ ہی نہیں کہ اپنے آپ کو ریزہ ریزہ کرتا ہے یا کسی اور کو۔ہاں اگر کچھ کانچ کے کھلونے باقی ہیں بھی تو پتھروں کی نظر ان پر رہتی ہے، کانچ کے کھلونے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی نہیں

جڑتے ، یہ کانچ کے کھلونے ہمارے دل میں ہمارے احساسات ہیں جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں، پتھر کے دور میں جذبوں کا کیا کام، پتھر کی ریاست میں احساسات کا کیا دخل، یوں سوچتے جایئے، سوچتے چلے جایئے، آپ کو نظر آئے گا اور آپ اتفاق کریں گے کہ جو ترقی ہم نے کی ہے وہ محض ایک سراب ہے، ایک خیالِ بے بنیاد ہے، ایک خوابِ نامراد ہے، ایک صبحِ عذاب ہے، ایک شامِ کرب و بلا ہے، ایک شبِ انتظار ہے اور طویل شبِ انتظار۔

☆☆☆

ماہنامہ سفید چھڑی کے پچیس سال

خواہ ہمیں سینکڑوں میل کا سفر کرنا ہو اس کے لئے پہلا قدم اٹھانا اہم ہوتا ہے، جب پہلا قدم اُٹھ جائے تو سفر جاری ہو جاتا ہے اور اگر ہمت اور حوصلہ ہو تو وہ سفر جاری و ساری رہتا ہے۔ بحمداللہ! ماہنامہ سفید چھڑی اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کر چکا ہے۔ یہ اگست ۱۹۹۱ کی بات ہے جب ہم پہلا شمارہ شائع کرنا چاہتے تھے، شاہد اسلام دانش نے (جو اَب انگریزی کے پروفیسر ہیں) اور ان کے ایک دوست نے مل کر ایک رات پرچے کی پیسٹنگ شروع کی اور فیصلہ کیا کہ وہ اس کو مکمل کر کے ہی دم لیں گے اس وقت پیسٹنگ کا طریقہ کار مختلف تھا اور خاصہ وقت لگتا تھا پیسٹنگ ہو گئی اور پہلا شمارہ شائع ہوا۔ جس میں گورنر پنجاب اور دیگر انتظامی اور علمی ادبی شخصیات کے پیغامات شامل تھے ہم سب کتنے خوش تھے کہ ہم نے ایک ایسا کام ذمہ لیا ہے کہ جو بظاہر بہت مشکل ہے لیکن ہمارے مقاصد کے حصول میں گراں قدر خدمات سرانجام دے گا۔ جریدے کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ ثابت کیا جائے کہ بصارت سے محروم افراد بھی وہ کام سرانجام دے سکتے ہیں جو بصارت سے مختص تصور کیا جاتا ہے اور علمی ادبی زندگی میں وہ کردار ادا کر سکتے ہیں جسے بینا حضرات ادا کرتے رہے ہیں۔ دوسرا مقصد اور اہم مقصد یہ تھا کہ ہم عوام الناس سے اپنے روابط قائم رکھ سکیں اور نابینائی کے بارے میں ان کے تصورات میں مثبت تبدیلیاں لا سکیں۔ انہیں عملی طور پر باور کرا سکیں کہ بینائی سے محروم ہونا ایک چیلنج ضرور ہے لیکن اس چیلنج کا بہادری سے بھی مقابلہ کیا جا سکتا ہے یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ بصارت سے محروم افراد بھی اسی طرح کے گوشت پوست کے انسان ہیں جیسے کہ وہ افراد جو دیکھ سکتے ہیں۔ بدقسمتی یہ رہی ہے کہ جب کسی کو معذوری لاحق ہو جاتی ہے تو تصور کر لیا جاتا ہے کہ یہ معذوری دل و دماغ کی ساری صلاحیتوں کو لے ڈوبے گی۔ اگر کوئی دیکھ نہیں سکتا تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس کی قوت سماعت بھی کمزور ہو گئی ہو گی اس کی

جذباتی اور احساساتی دنیا بھی سرد پڑ گئی ہو گی اس کے کھانے پینے کا انداز بدل گیا ہو گا اس کی جمالیاتی حس بھی مفقود ہو گئی ہو گی اور بعض حضرات یہ تک تصور کرنے لگتے ہیں کہ کوئی شخص جب معذور ہو گیا ہے اسی قدر ریہ پہنچی ہوئی شخصیت ہو گیا ہے، وہ پیر ہے، فقیر ہے مگر جیتا جاگتا، سوچتا، محسوس کرتا انسان نہیں، یہ ایک بہت بڑا المیہ رہا ہے۔ سفید چھڑی کے ذریعے ہم نے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معذوری مجبوری نہیں ہوتی ہاں! کچھ مشکلات ضرور پیش آتی ہیں اور وہ مشکلات اور مشکل ہو جاتی ہیں اگر معاشرتی رویے مثبت نہ ہوں، اگر کوئی شخص کسی معذوری کا شکار ہو جاتا ہے تو اسے سکوں اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے ترس کی نہیں۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جسے ہم نے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور اس میں ملک بھر کے شاعروں ادیبوں اور قلم کاروں نے ہمارا ساتھ دیا ہے، ہماری حوصلہ افزائی کی ہے، دامے درمے قدمے سخنے ہماری اعانت فرمائی ہے۔ یہاں اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے مالی معاونت کرنے والوں میں صاحبانِ قلم و قرطاس کا بڑا حصہ ہے، ان کے خطوط کے ذریعے حوصلے بڑھے ہیں اور ان کی مدد اور تعاون کے باعث ہم اپنے مقاصد کو حاصل کر سکے ہیں۔

ان پچیس برسوں میں ماہنامہ سفید چھڑی کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ اس میں صفِ اوّل کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی تخلیقات ہمیں روانہ کیں، ہم نے ہمیشہ ان تخلیقات کو شاملِ اشاعت کیا جو ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے خود ہمیں ارسال کیں۔ جن اہلِ قلم نے ہم سے قلمی تعاون کیا ان کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ہمیں خوشی ہے اور فخر بھی کہ ماہنامہ سفید چھڑی نے صحافت اور ادب کی دنیا میں اپنا کردار بحسن وخوبی انجام دیا ہے یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں اشتہارات نہیں مل سکے، شروع شروع میں ہم نے حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہمیں کچھ کامیابی بھی ہوئی لیکن پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ سرگودھا جس کے تحت یہ جریدہ شائع ہو رہا ہے کے کارکنان کی مصروفیات اتنی گوں نا گوں ہیں کہ ہم اشتہارات لینے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ ایک افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنے تنظیمی امور اور مقاصد کی تکمیل کے حوالے سے

رضا کاروں کی کچھ زیادہ خدمات حاصل نہیں رہی ہیں۔ہم کوئی سیاسی تنظیم نہیں کہ لوگ جوق در جوق اپنی خدمات پیش کرنے لگیں ہم کسی مذہبی تعصب کا بھی شکار نہیں کہ کسی خاص طبقے کی ہمدردیاں حاصل کرسکیں۔ہم تو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کی روشنی میں خدمت خلق سرانجام دیتے رہے ہیں جس میں بہت سے احباب نے یقیناً گراں بہا خدمات سرانجام دی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم نابینا حضرات کی تعلیم وتربیت کے لئے نو کنال زمین پر ایک ادارہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ہم نے نابیناؤں کے لئے بریل میں کتابیں منتقل کرنے کا ایک انتہائی فعال شعبہ بھی اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے اور نابیناؤں کو ریکارڈ کی ہوئی کتابیں دینے کے لئے ایک انتہائی فعال شعبہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ہم نابینا بچوں کو ایم اے تک تعلیم مفت دیتے ہیں، رہنمائی کرتے ہیں، کتابیں اور ہاسٹل کی سہولت دیتے ہیں۔جو بچے عام اداروں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں ان کے وظائف کا اہتمام کرتے ہیں کھیلوں میں ان کی سرگرمیوں کے حوالے سے بھی ہم اپنا کردار ادا کرتے ہیں، جہاں ہم کچھ حاصل کرپائے ہیں وہاں ہمیں مزید بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور یہ قارئین کرام آپ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔حال ہی میں نابینا بچیوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام بھی شروع کیا گیا ہے اور نابینا بچوں کو کمپیوٹر کی تربیت دینے کا اہتمام کیا ہے الغرض اپنے محدود ذرائع میں ہم جو کچھ کرپائے ہیں خلوصِ نیت سے کیا ہے، یہ ایک ایسی عبادت ہے جو اللہ کے فضل کے بغیر ادا نہیں ہوسکتی، خدمتِ خلق سب سے اعلیٰ عبادت ہے۔جو زندگی کے چراغوں کو فروزاں رکھتی ہے، جس سے خوشیوں کے پھول مہکتے ہیں، جس سے کامیابیوں کے علم بلند ہوتے ہیں، جس سے رنگ ونور کی بارش ہوتی ہے اور اللہ کی تائید وحمایت حاصل ہوتی ہے۔

ماہنامہ سفید چھڑی کے پچیس سالوں میں ہم نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ہم اپنے قلم کاروں اور ہر شعبہ فکر سے تعلق رکھنے والے قارئین کو اپنی کاوشوں سے آگاہ رکھ سکیں اور ہمیں کامیابی بھی ملی ہے، ماہنامہ سفید چھڑی کا یہ بھی امتیاز ہے کہ اب مختلف یونیورسٹیز میں اس پر تحقیق کا کام بھی شروع ہوگیا ہے، ماہنامہ سفید چھڑی اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ہے جو بے بصر حضرات کا

ترجمان بھی ہے اور اصحاب بصارت کی علمی ادبی تشنگی کی تسکین بھی کرتا ہے۔یہ ایسا جریدہ ہے جس کی اشاعت کا اصحاب قلم وقرطاس کو انتظار رہتا ہے، بار بار فون پر استفسار کیا جاتا ہے جس کی ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے اس میں کلام نہیں کہ ہمارے ذرائع محدود ہیں اور ان محدود ذرائع کے ہوتے ہوئے ہم نے نہ صرف علم وادب کی آبیاری کرنے کی مقدور بھر سعی کی ہے بلکہ زندگی کو اور تابناک اور توانا بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔

ہماری خواہش رہی ہے کہ اس پُرآشوب دور میں جہاں انسان، انسان کا شکاری بن گیا ہے، جہاں عزتیں محفوظ نہیں اور ہر وقت موت کا دھڑکا لگا رہتا ہے وہاں امید کی شمع بھی روشن رہنی چاہیے اور ہمارا جریدہ بفضل تعالیٰ ایک ایسی ہی شمع ہے۔ہمیں توقع ہے کہ آپ احباب کے تعاون سے یہ شمع فروزاں رہے گی یہاں ہم اپنے تمام کارکنان کے شکر گزار بھی ہیں جن کی مدد اور تعاون کے بغیر پرچے کی اشاعت جاری نہیں رہ سکتی تھی ایسے احباب کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، ہم فرداً فرداً شکریہ ادا نہیں کرسکتے تاہم ہم ایڈیٹوریل بورڈ جس کی ہمیں مشاورت حاصل ہے اور مجلسِ انتظامیہ اور اپنے ادارے کے تمام کارکنان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اتنے مشکل کام کو سب مل کر سرانجام دے سکے ہیں، ہم توقع کرتے ہیں کہ قارئین کرام آپ کی ہر انداز کی مدد ہمیں حاصل رہے گی تاکہ ہم بے بصر حضرات کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتے رہیں اور کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔آمین

☆☆☆

تاریخ: ایک حقیقت یا افسانہ

اس میں کلام نہیں کہ جو کچھ ماضی میں ہوتا رہا ہے وہی کچھ آج ہو رہا ہے، واقعات اور حادثات زندگی کا جزوِلاینفک ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ سب کچھ ایک جبر کے تحت ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ڈارون کی سوچ ایک حد تک درست نظر آتی ہے کہ واقعات کا تسلسل ایک میکانکی عمل یا جبر ہے لیکن اگر یہ تصور کر لیا جائے تو پھر انسانی مساعی اور انسانی ارادے کی کیا توجیح ہو گی یوں تو تمام کوششیں اکارت جائیں گی کون نہیں جانتا کہ اگر ہمارے سائنس دانوں نے سائنسی فتوحات نہ کی ہوتیں تو دنیا ویسی ہی ہوتی جیسی کہ ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ طلوعِ اسلام سے قبل انسانیت کس المیے سے دوچار تھی لیکن پھر پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ نے اپنے افعال اور کردار سے وہ انقلاب برپا کیا جس نے واقعات کے جبر کو شکست فاش دے دی ان کی شخصیت نے ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کا پہلے تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا تو پھر تاریخ جبری میکانکی کیونکر ہوئی، اگر روسو اور والٹیر اپنے افکار سے اہلِ فرانس میں ایک انقلابی روح پیدا نہ کرتے تو انقلاب فرانس کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا اور اگر انقلاب فرانس برپا نہ ہوتا تو شاید انسانیت صدیوں جہالت، تنگدستی اور جبر کے شکنجے میں جکڑی رہتی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ برِصغیر کے مسلمان کس اندوہناک صورتحال سے دوچار تھے۔ سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور قائدِ اعظم نے وہ معجزہ سرانجام دیا جس کے ثمرات سے ہم سب بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ یوں ہمیں ڈارون کا نظریہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا، بے شک حالات ایک رخ اختیار کر لیتے ہیں لیکن اگر انہیں تبدیل کرنے والے اصحاب ہمت نمودار ہو جائیں تو پھر حالات جو رخ اختیار کرتے ہیں اس کا پہلے سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو انسانی تاریخ کا ایک رخ ہے دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ بدقسمتی سے جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے یا ہو چکا ہوتا ہے وہ باوجود تاریخ

کا حصہ نہیں بنتا، ہوا کچھ اور ہوتا ہے اور مؤرخین کچھ اور بیان کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی نے کہا تھا۔

"No one can change history except the historian" اور سولہویں صدی کے ادیب اور نقاد سر فلپ سڈنی نے تاریخ کو "Mouse-eaten record" سے مماثل قرار دیا تھا یعنی ایسی باتیں جن کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ ہماری یادداشت ہوتی ہے اگر ہم تاریخ کو بھلا دیں تو ہمارے پاس یاد کرنے کیلئے کچھ بھی نہ ہوگا۔ ماضی بے معنی اور لایعنی ٹھہرے گا اور ماضی کے بغیر حال اور مستقبل جنم ہی نہیں لے سکتے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ انسانی ذہانت روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے یعنی ماضی ہی حال اور مستقبل کی تعمیر کرتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ مؤرخین بھی کسی علاقے سے متعلق ہوتے ہیں ان کے اپنے تعصبات اور نقطہ ہائے نظر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ، وہ کچھ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں جو وہ لکھ رہے ہوتے ہیں، جابرانہ قوتیں انہیں خامہ فرسائی پر مجبور کرتی ہیں اور وہ کچھ لکھواتی ہیں جو چاہتی ہیں مؤرخین بھی جابرانہ قوتوں کے تابع ہوتے ہیں، ان کا بھی کسی مذہب اور مسلک سے تعلق ہوتا ہے، وہ کسی نقطہ نظر کے علمبردار ہوتے ہیں اور کسی نقطہ نظر کو رد کر دینا چاہتے ہیں برِصغیر کی تاریخ پر ہی نظر ڈال لیجئے۔ واقعات کے بارے میں مسلمان مؤرخین کا نقطہ نظر ہندو مؤرخین سے قطعی طور پر مختلف ہے اکبر اور اورنگزیب کے بارے میں متضاد آراء ملتی ہیں اسی طرح حریت اور آزادی کی وہ جنگ جو اہلِ ہند نے لڑی، اُس کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔ ہر وہ کوشش جو آزادی کے لئے ہوتی ہے اگر ناکام ہو جائے تو مؤرخین اسے غدر سے تعبیر کرتے ہیں اور اگر کامیاب ہو جائے اسے جنگِ آزادی کہہ دیا جاتا ہے۔ ایک زمانے تک نیلسن منڈیلا کو دہشت گرد کہا جاتا رہا اور پھر جب وقت نے اسے کامیابیوں اور کامرانیوں سے سرفراز کیا تو اسے امن کا داعی کہا جانے لگا یہی کچھ تاریخِ عالم میں ہر جگہ ہوتا رہا ہے، اس لئے ہر لکھا ہوا حرف سچ پر مبنی نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے دروغ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، کبھی کبھی ذہن میں ایسے خیالات ابھرتے ہیں جس سے تاریخ محض

افسانہ نظر آتی ہے بہت کم مؤرخین ایسے ہوں گے جو تعصبات سے بالاتر ہو کر حقائق کا تجزیہ کرتے رہے ہوں گے ویسے بھی تاریخ کی کتب محض بادشاہوں کی فتوحات اوران کی ریشہ دوانیوں اوران کے اجمالی حالات پرمبنی ہوتی ہیں۔ کتنے ایسے مؤرخین ہوں گے جنہوں نے روحِ اصل کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ نویسی انتہائی دشوار کام ہے سچ بولنا اور بھی مشکل ہے اور خاص طور پر اپنے معاصرین کے بارے میں سچ تحریر کرنا بسا اوقات جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ انگریزی ادبی نقاد ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا کہ ہم اپنے معاصرین کے بارے میں سچ نہیں لکھ سکتے۔ کسی مصنف اور شاعر کے بارے میں اس کی وفات کے سو دو سو سال بعد ہی اس کے بارے میں سچی تحریریں معرضِ وجود میں آ سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ جس کے بغیر ہم اپنے ماضی سے آگاہ ہی نہیں ہو سکتے۔ ایک ایسا عمل ہے کہ جسے سرانجام دینا انتہائی دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تاریخ کی کتب جھوٹ کے پلندے ہیں اور اپنے عہد کے فرمارواؤں کے قصائد پر مبنی ہیں تو پھر سچ کا سوراغ لگانا کتنا دشوار ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ شاید انسان سچ بولنا سیکھ لے اور سچ لکھ سکے لیکن یہ کام جانے کب حقیقت کا روپ دھارے۔ کیا کوئی ایسا زمانہ وقوع پذیر ہوگا جب سچ بولنا سہل ہو جائے گا اور مؤرخ جھوٹ بولنے پر مجبور نہ ہوگا۔

☆☆☆

جنونِ تحریر

''جنون'' کون نہیں جانتا کہ حد سے بڑھے ہوئے شوق کو کہتے ہیں اور شوق کے کیا کہنے وہ تو ہر رنگ رقیبِ سروساماں ہوتا ہے، جب کاغذ نہیں تھا جو چیز ہاتھ لگتی تھی اس پر لکھ لیا جاتا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ غار میں رہنے والا انسان چاہے کچھ نہیں لکھتا تھا۔ لیکن جو دیواروں پر تصویریں سی بنی ہوتی تھیں، وہ بھی کچھ لکھ دینے کی خواہش ہی کی غماز تھیں۔ ویسے لکھنا کوئی آسان کام بھی نہیں کتنے لوگ ہیں جن کے دماغ میں جانے کتنے خیالات انگڑائیاں لے رہے ہوتے ہیں لیکن ان کا قلم و قرطاس سے کوئی رابطہ نہیں ہو پاتا۔ ہاں! پہلے لوگ تو خط ہی لکھا کرتے تھے جو نہیں لکھ سکتے تھے وہ کسی اور سے لکھوایا کرتے تھے، دو سطور لکھنے کے لئے وہ جانے کتنا وقت صرف کرتے تھے اور کرواتے تھے۔ بہر کیف جب لکھنے لکھانے کی روش عام ہوئی تھی ایک آدھ فی صد لوگوں میں لکھنے کی خواہش مچلنے لگی ہوگی تو وہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہوں گے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ لکھنے کا عمل بہت تیز ہونے لگا، پریس نے تو انقلاب ہی برپا کر دیا، کتابیں ہی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ کتب خانوں کا رواج ہوا اور جگہ جگہ کتب خانے نظر آنے لگے، لیکن قارئین کی تعداد ہمیشہ بہت کم رہی، صرف وہی کچھ پڑھا گیا جو نصاب کا حصہ ہوتا تھا۔ ہاں کچھ ایسے منچلے ضرور تھے جو کتابی کیڑے بن گئے تھے اور ہر وقت انکے ہاتھ میں کتاب ہی ہوتی تھی مگر ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ پڑھنے کا رواج اور کم ہونے لگا، صرف اخبار پڑھے جانے لگے۔ یقیناً کچھ لوگ پھر بھی ایسے تھے جو کتاب کو زندگی کا حصہ سمجھتے تھے اور انہیں ایک دو گھنٹے پڑھے بغیر رات کو نیند تک نہیں آتی تھی لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ اس کے باوجود کتابیں تحریر ہوتی رہیں، دن رات چھپتی رہیں، کتب خانے بھر گئے جن میں ایسی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی بلکہ اب بھی ہے یا کہہ لیجئے زیادہ ہے کہ بیشتر کتابیں کسی نے کبھی کھول کر ہی نہیں دیکھیں۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ

انسان میں لکھنے کا خبط کیوں ہے، وہ کیوں لکھنا چاہتا ہے ایک وجہ تو یہی کہی جا سکتی ہے جو ارسطو نے ادب وفن کے بارے میں کہی تھی یعنی یہ کہ لکھنے سے کچھ کتھارسز کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے ہاں شاید ایسا ہی ہے کئی بار تو یہ خوشی محسوس ہوتی ہو گی کہ واہ میں نے کتاب لکھ لی ہے۔ اسے کتنے لوگ پڑھتے ہیں کتنے نہیں پڑھتے اس سے قطع نظر کتاب کا لکھا جانا اور اس کا شائع ہونا سکون ضرور دیتا ہے مگر شاید یہ سکون اس وقت لٹ جاتا ہے یا کہیے کم ہو جاتا ہے جب اس کتاب سے کچھ بھی آپ کو حاصل نہیں ہوتا کوئی اسے نہیں خریدتا اور جنہیں آپ تحفتاً دیتے بھی ہیں وہ اسے سنبھال کر رکھ دیتے ہیں یا ان سے کوئی اور لے جاتا ہے اور پھر کبھی کبھی وہ سیکنڈ ہینڈ بکس کی صورت میں سڑکوں پر پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بہر حال اس صورت حال نے کوئی خاص فرق نہیں ڈالا۔ ڈالتا بھی کیسے، ہم نے کہا نا یہ تو جنونِ تحریر ہے اور جنون کا عقل سے بہت کم تعلق ہوتا ہے۔

بہر کیف کتاب نے بڑا کردار ادا کیا ہے خواہ وہ آسمانی کتابیں ہوں یا زمینی ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، تاہم وقت کے ساتھ ساتھ کتب بینی بہت کم ہو گئی ہے اور انٹر نیٹ نے تو صورتحال اور بھی مخدوش کر دی ہے لیکن ایک دوست کہہ رہے تھے ایسا نہیں ہے آخر نیٹ پہ جو کتابیں ہوتی ہیں وہ پہلے تحریر ہی تو ہوتی ہیں تبھی تو نیٹ تک پہنچتی ہیں، جی ہاں! یہ بھی درست ہے لیکن اس جنون میں ایک اور جذبہ بھی شامل ہوتا ہے لکھاری یہ سمجھتا ہے کہ یہ کتاب جو وہ تحریر کر رہا ہے اس کی شہرت میں تو اضافہ کرے گی ہی اسے لافانی بھی بنا دے گی جیسے چار پانچ ہزار سال پہلے بھی جو کتب لکھی گئیں ان میں سے بہت سی ابھی تک پڑھی جا رہی ہیں لیکن شاید ایسا نہیں لاکھوں کتابوں میں سے شاید سیکڑوں کتابیں ایسی ہوں جو کتب خانوں میں موجود ہوں اور بہت کم تعداد انہیں پڑھتی ہو ہاں جو کتابیں نصاب کا حصہ بن جاتی ہیں ان کی بات کچھ اور ہے اور نصاب کا حصہ بننے کے لئے جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ہاں جو لوگ ہم میں نہیں ان کی کتابیں جب داخلِ نصاب ہوتی ہیں تو ان میں شاید لکھنے والوں کی قابلیت کو ملحوظِ نظر رکھا جاتا ہے یا کبھی ایسا اتفاقاً بھی ہو جاتا ہے اس میں نصاب سازوں کے ذوق کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے ان کا یہ ذوق جادوئی

اثر رکھتا ہے اور وہ کچھ بھی ہو جاتا ہے جو ہوا نہیں ہوتا، اس جنون کی اور بھی کئی صورتیں ہیں لیکن میں سوچتا ہوں کہ اخلاقیات، روحانیت اور انسانی اصلاح اور فوز و فلاح کے حوالے سے کتنی کتابیں تحریر ہوئی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کے اثرات بہت کم ہوئے ہیں۔ اگر ان کے اثرات ہوتے تو کچھ تو فرق پڑتا، کچھ تو ظلم کم ہوتا۔ کچھ تو بے انصافی کا قلع قمع ہوتا، بد دیانتی کچھ تو کم ہوتی، انسان میں درندگی کا کچھ تو خاتمہ ہوتا۔ گو چنگیز اور ہلاکو تو نہیں رہے لیکن ہمارے اس نام نہاد مہذب دور میں ایسے ظالموں اور سفاک لوگوں کی کوئی کمی نہیں بلکہ اب اشخاص نہیں اقوام ظالم ہو گئی ہیں بلکہ عقائد ظالم ہو گئے ہیں، سوچ مسموم ہو گئی ہے مفادات بھیڑیے بن گئے ہیں خود غرضیوں نے دن دیہاڑے لوٹ مار شروع کر دی ہے تو پھر ان خوبصورت کتابوں اور خوبصورت لکھنے والوں کا کیا اثر ہوا۔ انسانیت تو وہیں کھڑی ہے جہاں تھی یا شاید اس نے جانے اور کتنے اذیت ناک مواقع پیدا کر دیئے ہیں، دنیا جیل خانہ بن کر رہ گئی ہے، عقوبت خانے ہماری تہذیب کا طرۂ امتیاز ہیں۔ آپ جب چاہیں پوری قوم کو مٹا کر رکھ دیں پوری آبادیوں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیں تو پھر جنون تحریر کا کیا جواز رہتا ہے۔ لیکن کہا نا جنون کا کوئی جواز نہیں ہوتا، پاگل پن میں خرد کا کیا کام، ایسا لگتا ہے کہ یہ دیوانگی اور پاگل پن جاری رہے گا اور اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس جنونِ تحریر کا شکار مجھ جیسے سینکڑوں ہوتے رہیں گے۔

☆☆☆

خواب اور تعبیرِ خواب

خواب دیکھنا شاید بلکہ یقیناً انسان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ خواب نہ دیکھے تو وہ مر جائے گا، ہر شام کو صبح کا خواب آنکھوں میں سجا ہوتا ہے اور ہر صبح کو پورے دن کی تمنائیں، آرزوئیں اور خواہشیں آنکھوں میں جھلملاتی محسوس ہوتی ہیں۔ خوابوں کا تعلق شب و روز تک نہیں بلکہ ان کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے ان کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، کوئی زمین و آسمان نہیں ہوتے، لیکن اگر خواب حدود و قیود سے مطلقاً آزاد ہو جائیں تو سہانے روح اور آزاد جسم و جاں بن جاتے ہیں، خواب دیکھنا خوش آئند عمل ہے مگر شاید خوابوں میں جینا کوئی مستحسن عمل نہیں۔ بچہ خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے بلکہ ماں باپ اور اس کے بزرگ اس کی آنکھوں میں خواب سجانے لگتے ہیں، معاشرہ اور ماحول اسے نت نئی تمناؤں اور آرزوؤں سے آشنا کر دیتا ہے، وہ فلاں پیشہ اختیار کرے گا، وہ فلاں خدمات سرانجام دے گا، اس کی زندگی ایسی ہوگی۔ پھر جوں جوں بڑا ہوتا ہے تو اس کے خواب شدید ہونے لگتے ہیں، کبھی اس کے خواب راتوں کی نیند ہی لوٹ لیتے ہیں، اسے دن کے سکون سے محروم کر دیتے ہیں، وہ اپنی شریکِ حیات کے خواب دیکھنے لگتا ہے اور ہونے والی شریکِ حیات اس کی زندگی پر مسلط ہونے لگتی ہے، اسے ہم سفر کی تلاش کہیں چین نہیں لینے دیتی اور یوں اس کی زندگی کا سفر طے ہوتا چلا جاتا ہے۔

خواب قومیں بھی دیکھتی ہیں اور زمانے بھی دیکھتے ہیں، ایک خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا، وہ خواب نیند کے دوران نہیں تھا بلکہ انہوں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا، پھر اس خواب میں بہت سے شامل ہو گئے اور پھر ایک حسین صبح اس خواب کی تعبیر بنتی ہوئی نظر آنے لگی لیکن پھر کیا ہوا یہ ہم سب کو معلوم ہے، شاید ہم نے اپنے خوابوں سے انصاف نہیں کیا یا ہم نے اپنے خواب بدل لئے، خوابوں سے اپنی آنکھوں کو بوجھل کر دیا، جسم کو چور چور کر دیا، روح پارہ پارہ ہو گئی

اور پھر سارے خواب ڈراؤنے خواب بننے لگے اور بنتے جا رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خواب کا حقیقت سے چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے، ان میں بُعد روح اور جسم کے رشتے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ہم محض مادی دنیا میں نہیں رہتے، دو اور دو چار سے بہت بلند ہوتے ہیں اور یہی صورتحال ہمیں آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب ہم اچھے دنوں کے خواب دیکھتے ہیں تو کبھی کبھی ہم بھول جاتے ہیں کہ اچھے دن نازل نہیں ہوتے، اچھے دن خریدے نہیں جا سکتے، نہ چوری اور ڈاکے سے اچھے دنوں کو حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ اچھے دنوں کے لئے اچھے اچھے اور پیارے پیارے کام کرنے پڑتے ہیں۔ حسین ارادے تراشنے پڑتے ہیں اور پھر ان پر مستقل مزاجی سے جینا ہوتا ہے۔ دراصل جب خواب ختم ہو جاتے ہیں تو زندگی ختم ہو جاتی ہے، ہم نے ایسے احباب دیکھے ہیں جن کے کوئی خواب نہیں ہوتے سوائے اس کے کہ انہیں منوں مٹی تلے دب جانا ہے، منوں مٹی تلے دب جانا ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے مگر جب تک سانس ہے اس وقت تک آس ہوتی ہے، کے مصداق آس کا موجود رہنا زندگی کی ضمانت ہے، مایوسیاں اندھیروں کی طرف لے جاتی ہیں قنوطیت کے غاروں میں دھکیل دیتی ہیں اور امن کی قوت سلب کر دیتی ہیں لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ آرزوئیں بے لگام نہیں ہونی چاہئیں اور نہ ہی آرزوئیں مطلقاً خودغرضانہ ہونی چاہئیں، مجھے اپنی آرزو کو پروان چڑھاتے وقت کسی کی آرزو کا خون نہیں کرنا چاہیے، اپنے چین اور آرام کے لئے کسی کا چین اور سکون غارت نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ تو خواب نہیں بلکہ استحصال ہوگا، زندگی کا قتل ہوگا، غارت گری ہوگی اور شومئی قسمت سے اس مہذب دنیا میں، اس پڑھے لکھے دور میں علم و آگہی کے اس عہد میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، دن دیہاڑے ہو رہا ہے، تیسری دنیا بھی اس میں محو ہے اور پہلی اور دوسری دنیا بھی۔ امیر امیر تر ہونا چاہتا ہے اور غریب بھی اگر بس چلے تو امیر کا سب کچھ چھین لینا چاہتا ہے، یہ خوابوں کا وہ ریلہ ہے جو سب کچھ بہا لے جاتا ہے کاش کہ ہمیں اپنی آنکھوں میں ایسے خواب سجانے آ جائیں جس سے ہماری ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی قسمت بدل جائے اور ہم ایک ہو کر رہنا سیکھ لیں۔ عالمی گاؤں کی بات تو کی جاتی ہے، ہر شخص کے لب پر عالمی گاؤں کا ذکر

ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسے ہم عالمی گاؤں کہتے ہیں وہ دراصل ایک ایسا جزیرہ ہے جو زندگی سے کٹ گیا ہے، جہاں کسی کو اپنے پاس بیٹھے ہوئے، اپنے کمرے میں سوئے ہوئے انسان کے دکھ اور سکھ کا احساس نہیں، محض آلات سکون کا ضامن نہیں ہو سکتے۔ شاید ہم نے وقت کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو، شاید ایسا نہیں۔ مہینوں کے فاصلے لمحوں میں طے کر کے ہم وقت کو گرفت میں نہیں لے سکتے، وقت گرفت میں لینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم لمحوں میں جینا سیکھیں اور دوسروں کو جینے دیں، بردباری، شائستگی، قوتِ برداشت، ہم آہنگی اور اخوت ہمارے رویّوں میں سرائیت کر جائے اور یوں ہم دنیا کو ایک جنت بنا دیں اور ہمیں اپنے خوابوں کی تعبیریں ملنے لگیں جو اس کرۂ ارض کو سکون سے مالا مال کر سکے۔

☆☆☆

ہمتِ عالی کو میں بے بال و پر اچھالوں گا

وہ لوگ جو زندگی میں نشیب و فراز سے دوچار ہوتے رہے ہیں، جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوئے، جن کے گھر میں دولت کی ریل پیل نہیں، جنہیں تمام عمر جدوجہد سے کام لینا پڑتا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس طرح قدرت، مشکلات میں ایسے اسباب پیدا کر دیتی ہے کہ مشکلات از خود کافور ہونے لگتی ہیں۔ مانا کہ مشکلات، مشکلات ہوتی ہیں اکثر و بیشتر ہمتیں جواب دینے لگتی ہیں، ایسا لگتا ہے کہ مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے لیکن ایسا اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب مشکلات پیدا ہوتی ہیں جب آزمائشیں درِ زندگی پر دستک دینے لگتی ہیں تو صلاحیتیں از خود بیدار ہونے لگتی ہیں۔ ہمت پر پُرزے نکالنے لگتی ہے، ہاتھ پاؤں میں طاقت آنے لگتی ہے، جیسے کوئی غیبی طاقت کرشمہ سرانجام دے رہی ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ قدرت نے انسان کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے، یہ وہی صلاحیتیں ہیں جن کا ذکر علامہ اقبال نے اپنے فلسفہ خودی میں کیا ہے یعنی یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دل و دماغ کی وہ قوتیں عطا کی ہیں جو مسِ خاک کو کندن بنا سکتی ہیں، پہاڑ رائی میں تبدیل ہونے لگتے ہیں، انسان بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے لگتا ہے، اس کا اشہبِ علم و فکر اس طرح جولانیاں دکھانے لگتا ہے کہ خود انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے اسے سمجھ نہیں آتی کہ یہ غیر معمولی قوت پرفقید المثال طاقت یہ بے پناہ صلابت اس میں کہاں سے آ گئی ہے، دراصل ہم سب جانتے ہیں کہ جب مصائب درپیش ہوتے ہیں تو انسان اپنی ذہنی اور روحانی طاقت سے ان کا حل بھی تلاش کر لیتا ہے علامہ اقبال نے کہا تھا

خطر تاب و تواں را امتحان است
عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

یہ وہ حقیقت ہے جسے شیکسپیئر کے ایک کردار نے یوں ادا کیا ہے۔ Sweet are

the uses of adversity یعنی یہ کہ دکھوں میں صلاحیتیں پنپتی ہیں اور اگر زندگی سیدھے رستوں پر چلتی چلی جائے تو بسا اوقات انسان رستہ ہی بھول جاتا ہے لیکن جب اسے رستہ خود تلاش کرنا ہو تو پھر وہ چاق و چوبند رہتا ہے ہوشیار رہتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے رستہ خود تلاش کرنا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جو تلاش کرتے ہیں وہ پا بھی لیتے ہیں وہ فارسی میں کہتے ہیں ناں! جوئندہ یابندہ یعنی یہ کہ The seeker is finder۔ روز اخبارات میں ایسے بچے اور بچیوں کی کامیابی کی داستانیں پڑھنے کو ملتی ہیں جنہوں نے انتہائی عسرت اور بے سرو سامانی میں دل و دماغ کی بے پناہ صلاحیتوں کا اظہار کیا اور مختلف امتحانات میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں۔ کیونکہ انہیں احساس تھا کہ انہیں جینے کے لئے کچھ کرنا ہوگا۔ کچھ کرنے کی خواہش کچھ کرنے کے اسالیب خود تراش لیتی ہے۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

مجھے تو وہ دن بھی یاد ہیں جب میں بینائی سے محروم ہو گیا تھا اور عزیز و اقارب کہا اٹھے تھے کہ اب ساری زندگی ختم ہوئی سب تماشا ختم ہو گیا اب کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ لیکن "اب کچھ بھی نہیں ہو سکے گا" کے جملے نے مجھ میں کچھ کرنے کی وہ سکت پیدا کی کہ جو آج تک ختم نہیں ہوئی میں نے جب ایم اے، انگریزی میں کرنا چاہا تو میرے اساتذہ نے ازراہِ ہمدردی مجھے کہا کہ اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالو۔ انہوں نے والد صاحب کو بھی کہا کہ اسے ایسا نہ کرنے دیں لیکن میرے اندر سے آواز آئی کہ اگر کوئی اور ایم اے انگریزی کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں؟ میری زندگی میں ایسے بہت سے موڑ اور بھی آئے جب میرے قدم ڈگمگانے لگے لیکن پھر اندر سے آواز آئی کہ ہمت اور لگن سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے میں نے اُن عظیم شخصیات کے کارنامے ہمیشہ پڑھے جنہوں نے تاریخ کے سینے کو اپنے کارناموں سے روشن کر رکھا ہے۔ اس لئے میری رائے میں بے بال و پری، بال و پر عطا کرتی ہے۔ یہ بال و پر عزم و ہمتوں کے بال و پر ہوتے ہیں، حوصلے کے ہوتے ہیں۔ وطن عزیز پر بھی آج کل غموں کی یورش ہے کچھ مایوسی کے پردے اتنے دبیز ہو گئے ہیں کہ امید کا چراغ بجھتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن میری رائے میں ناامید ہونا کفر کا مرتکب ہونا ہے، ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے اجداد نے کتنی صعوبتیں برداشت کیں، کتنے مظالم سہے کتنے اندھیروں نے گھیرا ظلم و استبداد کا شکار ہوئے لیکن پھر راہیں آسان ہو گئیں ہمت کے چراغ جلنے لگے اور مسلمان ممالک نمودار ہونے لگے۔ خود قیامِ پاکستان عزم و ہمت کا منہ بولتا ثبوت ہے اس لئے ہماری رائے میں انتہائی مشکلات بھی انسان کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکتیں، دکھوں کا علاج موجود رہا ہے، مشکلات آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں کبھی اچھے دن آتے ہیں تو کبھی برے دن۔ وہ شیلی نے کہا تھا! oh! if winter comes can spring be far behind! یہی دستورِ حیات ہے یہی تاریخ کا درس ہے اس لئے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمتِ عالی تخلیق کرنے کی ضرورت ہے حوصلے تراشنے کی ضرورت ہے، یہ تخلیق کا عمل یہ سعی و کاوش کے سلسلے جاری رہنے چاہئیں۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی   اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

زندگی آگے بڑھنے اور آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے آگے بڑھنے کے عمل میں بے پناہ نشیب و فراز آتے ہیں یہ زندگی اٹل حقیقت ہے لیکن ہمیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ اگر امید کے چراغ جلتے ہیں اور کوششوں کا فانوس روشن ہو تو گھٹا ٹوپ اندھیرے بھی کافور ہو جاتے ہیں اور امید کا سورج طلوع ہوتا ہے اور ہر طرف روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے رجائیت اور امید زندگی کا زیور ہیں اور یہی مشیتِ ایزدی بھی۔ تاریخِ اسلام ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب کوئی رستہ نہ تھا تو رستہ بنا لیا گیا، بس راستے بنانے کی خواہش ہونی چاہیے کچھ کرنے کی تمنا ہونی چاہیے آگے بڑھنے کا جذبہ موجود رہنا چاہیے پھر ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے اور اچھے دن لوٹ آتے ہیں۔

☆☆☆

قرض کا آسیب

وہ غالب نے کہا تھا!

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالب کی فاقہ مستی رنگ لائی یا نہیں لائی، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ لیکن وطنِ عزیز کے حوالے سے ایسا لگتا ہے کہ ہماری قوم بھی اس مغالطے کا شکار رہی ہے۔ بے چاری قوم کا کیا قصور ہمارے حکمرانوں نے بلا دریغ قرض لئے اور کچھ حسین خواب انہوں نے دیکھے اور کچھ قوم کو دکھائے۔ یہ درست ہے کہ قیامِ پاکستان کی پہلی اور دوسری دہائی میں فاقہ مستی کچھ رنگ لائی لیکن پھر کیا ہوا، کیسے ہوا، کیوں ہوا، اس پر گفتگو ہی خرمنِ زندگی پر برق گرانے کے لئے کافی ہے جس میں پوری قوم جل رہی ہے، راکھ ہوا چاہتی ہے۔ کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے کہ ہم پر بے پناہ قرضہ ہے، ہر پیدا ہونے والا بچہ مقروض پیدا ہوتا ہے، یہ گفتگو تو سیاست دانوں کو زیب دیتی ہے یا مفکرین کو اور دانشوروں کو الیکٹرانک میڈیا کے اینکرز کو کہ وہ ہمیں بتائیں کہ صورتحال اصل میں کیا ہے؟ لیکن جس قرض کی بات ہم کرنا چاہتے ہیں وہ قرض اس قرض سے بالکل مختلف ہے اور اس قرض کی ادائیگی کا خیال ہمیں کبھی نہیں آتا اور اس میں ہم دن بدن دبے جاتے ہیں، ختم ہوئے جاتے ہیں، ہم نے جو کچھ زندگی کی دوڑ دھوپ میں حاصل کیا وہ بس یہی کچھ تھا کہ ہم دھڑا دھڑ قرض لیتے رہیں، سوچ کا قرض، فکر کا قرض، ایجادات کا قرض، دریافتوں کا قرض، قرض ہی قرض...... آیئے! کچھ گرمیِ بازار دیکھئے، کونسی مشین ہے جو ہم نے ایجاد کی ہے، کونسی دوا ہے جو دھڑا دھڑ بکتی ہے، کونسے برقی آلات ہیں جن پر عوام الناس کا اعتماد ہے، کونسی کتابیں ہیں جو ہمارے نصاب میں شامل ہیں، کونسی سوچ ہے جس کے ہم اسیر ہیں، ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ موجودہ جمہوریت مغرب کی دین ہے، یہ جمہوریت اسلامی جمہوریت نہیں اور اس وقت اسلامی جمہوریت پر گفتگو کرنے پر ہمارا ارادہ بھی نہیں کیونکہ ساری گفتگو اکارت

جائے گی سنے گا کون۔ ہر گفتگو میں جب تک مغربی فلسفیوں، ناقدین، سائنس دانوں، سیاحوں کا نام نہ آئے تو گفتگو گفتگو ہی نہیں ہوتی۔ یار لوگ کہتے ہیں کہ ہم احساسِ کمتری کا شکار ہیں ہم اپنے بڑوں کی بات کیوں نہیں کرتے مگر ہمیں معلوم ہے کہ ہم اپنے بڑوں کی بات کریں تو کس حوالے سے! ماناکہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے علم و دانش میں گراں بہا خدمات سرانجام دیں لیکن ساتھ ساتھ یہ ہوا کہ سلطنتِ اسلامیہ پھیلتی چلی گئی اور اسلامی فکر سکڑتی چلی گئی، سوچ مفقود و مفلوج ہو گئی، ہمارے صاحبانِ اقتدار دادِ عیش دینے لگے، خواہ وہ عباسی تھے یا عثمانی، سلاطینِ دہلی یا مغل، یہ سب دادِ عیش دیتے رہے، ان کے دن رات تعیش میں گزرتے تھے، ان کی آنکھیں حسن سے مخمور ہوتی تھیں، ان کے جذبے عشق سے لبریز ہوتے تھے، کسی نے عمارتیں بنوادیں تو کسی نے چند سڑکیں تو کسی نے کچھ اور چھوٹے موٹے کام، جنہیں کام کہا ہی نہیں جا سکتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم غیروں کے مقروض ہوتے گئے سب کچھ ان سے لیا جنہیں ہم ناپاک، کافر، نا ہنجار، ظالم اور سفاک کہتے ہیں وہ جنہوں نے ہماری اینٹ سے اینٹ بجادی، ہماری تمام خواہشات اور تمناؤں کو خاکستر کر دیا، وہ ساتھ ساتھ ہم سے قوتِ فکر اور قوتِ عمل بھی لے گئے وہ ہمارے ہاتھ شل کر گئے۔

ہم نے کوئی چیز ایجاد نہیں کی، کچھ دریافت ہی نہیں کیا۔ یہ قرض جو اُن قوموں کا ہم پر ہے جنہیں ہم اپنا بدترین دشمن کہہ کر اپنا ایمان تازہ کر لیتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ایک زمانہ تھا اور مہلک بیماریاں سوہانِ روح بنی ہوئی تھیں۔ تپ دق تھی جس کا کوئی علاج نہ تھا، ملیریا تھا جو ہمیں چاٹے جاتا تھا، ہم ٹائیفائیڈ سے بھی جانبر نہیں ہو سکتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ جب نئی بیماریاں آئیں تو اس کا تدارک بھی انہی اقوام نے کیا جو فکر اور عمل کی دولت سے مالا مال ہیں، ہم نے صرف استفادہ کیا، ان کی بنی ہوئی ادویہ استعمال کیں، ان کے تیار کردہ ملبوسات زیبِ تن کئے، ان کی مشینوں سے اپنے کارخانے چلائے، اپنے گھر روشن کئے، ان کی کاوشوں سے آج ہم موبائل بڑی شان کے ساتھ ہاتھوں میں تھامے پھرتے ہیں اور دنیا کے ہر کونے میں ہر ایک کو سن لیتے ہیں۔ بلکہ دیکھ لیتے ہیں کتنی حیرت انگیز بات ہے مگر یہ حیرتیں، یہ استعجاب ہماری دھرتی سے

نہیں پھوٹا، ہم نے تو جو کچھ اُگایا بھی وہ بھی دوسروں کے حوالے کرتے رہے ہیں اور کرنا پڑا۔ کپاس ہم نے اُگائی ملبوسات انہوں نے تیار کئے جن کے ذہن اور جن کے ہاتھ ہر وقت محوِ عمل رہتے تھے۔ کیا ہم اس قرض کو ادا کر سکیں گے، کیا اس احسان کا جواب دے سکیں گے، کیا ہم ان اقوام کو بدلے میں ایسا کچھ دے سکیں گے کہ ہم کہہ سکیں ہم بھی کچھ کرنے کے قائل ہیں، ہمارا ذہن بھی سوچتا ہے، ہمارے ہاتھ بھی کام کرتے ہیں، پاؤں بھی چلتے ہیں۔ نہیں! شاید مستقبل قریب میں ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہم تو ''پدرم سلطان بود'' کہہ کر خوش ہو لیتے ہیں، اپنی چند عظیم شخصیات کا ذکر کر کے اپنا سر بلند کر لیتے ہیں۔

علامہ اقبال نے جو فکر ہمیں دی ہم نے اس فکر سے کیا حاصل کیا۔ بلکہ علامہ اقبال نے تو اپنی قوم کو بیدار کیا لیکن بیدار وہ قومیں ہو گئیں جن میں قوتِ عمل موجود تھی۔ قائدِ اعظم نے ہندوؤں اور انگریزوں سے نبرد آزما ہو کر وطنِ عزیز ہمارے ہاتھ میں تھما دیا اور ہم نے اس وطن کا وہ حشر کیا کہ اب قیامتِ صغریٰ بلکہ قیامتِ کبریٰ قریب قریب نظر آتی ہے۔ ہم نے اپنی عظیم شخصیات کے نظریات کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ وقت بہت سفاک، تاریخ بہت ظالم ہے۔ آسمان کی آنکھ سب کچھ دیکھ رہی ہے، زمین ہمارے قدموں کی آہٹ سن رہی ہے اور سب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ وہ قومیں جو دوسروں کے خیالات، دوسروں کی کوششیں اور دوسروں کے کارناموں کی بنیاد پر زندگی گزار کر خوش ہو لیتی ہیں وہ کبھی جریدۂ حیات پر اپنے نقوش نہیں چھوڑ سکتیں۔ ان کی داستانیں کسی کو یاد نہیں رہتیں، ایسی قومیں صفحۂ ہستی سے ملیا میٹ ہو جاتی ہیں اس کا احساس ہمیں نہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ احساس ہم میں کب پیدا ہو گا یا سرے سے پیدا ہو گا بھی یا نہیں۔

☆☆☆

تصانیف

شاعری:	1۔ساحلِ تشنہ لب	(1982)
	2۔سوالیہ نشان (دو ایڈیشن)	(1989)(1993)
	3۔اک ہمسفر اچھا لگا	(1998)
	4۔تلاوتِ دل (مجموعہ حمد و نعتؐ)	(1998)
	Love's no Crime_5	(2005)
	6۔یہ کافر دل نہیں مانا	(2007)
	7۔اس کے نام	(2014)
	8۔نہ عشق نوں لیکاں لائیں	(2016)
تنقید:	1۔جون ڈن شخصیت اور شاعری	(1993)
	2۔اقبال بحضورِ اقبال	(1999)
	3۔جون کیٹس شخصیت اور شاعری	(2001)
نثر:	1۔ذوقِ تماشا	(1993)
	2۔جہانِ مہ و پرویں	(1997)
	3۔دیدۂ دل	(1998)
	4۔کب رات بسر ہو گی	(2001)
	5۔آشوبِ آگہی	(2007)
	6۔مجھے ہے حکمِ اذاں	(2012)
	7۔ڈپریشن، علامات، اسباب اور علاج	(2013)
	8۔یا اللہ!	(2018)
خود نوشت:	1۔پردۂ سیمیں سے (چند سوانحی جھلکیاں)	(2009)